سندھ
اور
قومی حقِ خودارادیت

جیئے سندھ محاذ

سندھ

اور قومی حقِ خود ارادیت

جیئے سندھ محاذ

کتاب کا نام: سندھ اور قومی حقِ خود ارادیت

جیئے سندھ محاذ

ترجمہ: مشتاق علی شان

پہلا ایڈیشن: ڈسمبر 2016ء

تعداد: ایک ہزار

پرنٹر: نئوں نیاپو اکیڈمی سچل گوٹھ، کراچی، سندھ
Ph # 021-34690389,Cell # 0333-2311582
E-mail: naonniapo@yahoo.com

قیمت: 40روپے

دیباچہ

قیام پاکستان کے وقت سندھ کے باشندے یہ سمجھتے تھے کہ ان کے مسائل، مصیبتوں اور مشکلات ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس ہی تھا۔ مسائل اور مصائب کا غیر مختتم سلسلہ تو اپنی جگہ، الٹا ان میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ نہ صرف پرانے مسائل میں اضافہ ہوتا رہا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سندھی باشندوں کے لیے نت نئے مسائل بھی پیدا ہوتے رہے۔ یہ مسائل یا تو ریاست کے مختلف فیصلوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے یا پھر ان میں ریاست کی آشیر باد، تائید و ایما اور مدد شامل رہی ہے۔

نئے ملک کے منصۂ شہود پر آتے ہی ہزاروں سال سے سندھ وطن کے باسیوں کو بے وطن کر کے ان کی جگہ غیر سندھیوں کو باہر سے لا کر آباد کرنے سے سندھ اور سندھیوں کے لیے مسائل اور مصیبتوں کے ایک ایسے لامتناہی سلسلے کی ابتدا ہوئی جس کا اس سے قبل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کراچی کو سندھ سے الگ کر کے مرکز کے حوالے کرنے سے لے کر 2011 کی مردم شماری میں سندھیوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی کوششوں تک سندھ دشمن فیصلوں، اعمال اور حکمت عملیوں

کا سلسلہ جاری ہے۔ کبھی سندھی زبان کے ساتھ ناروا سلوک تو کبھی ون یونٹ کی صورت میں سندھ پروار، کبھی پانی کی تقسیم میں دھوکہ دہی تو کبھی کالاباغ ڈیم اور گریٹر تھل کینال کے منصوبے، کبھی سندھ کی مالیات پر ڈاکہ تو کبھی سندھیوں کے کلچر پر حملہ۔ غرضیکہ کچھ دن بعد کسی نہ کسی شکل میں سندھ کے قومی تشخص پر حملہ ہوتا ہے اور ایسے مسائل پیدا کیے جاتے ہیں جو سندھ کے باشندوں کے لیے زندگی اور موت کی سی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

یہ فطری بات ہے کہ سندھی باشندے ان مسائل کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور ان کا سامنا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں، ادبی اور سماجی تنظیمیں، ادیب و دانشور اور لکھاری، سب احتجاج کرتے ہیں، واویلا کرتے ہیں، انصاف کے نام پر حکمرانوں سے اپیلیں کرتے ہیں۔ اپنے سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کے حصول کے لیے کبھی عدالتوں میں کیس داخل کیے جاتے ہیں تو کبھی اسمبلیوں سے قانون اور قراردادیں پاس کی جاتی ہیں، لیکن حکمرانوں کا رویہ ''زمیں جنبش نہ جنبش گل محمد'' کے مصداق ہوتا ہے اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ ایک مسئلہ کھڑا کرتے ہیں، ہم اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے سراپا احتجاج ہوتے ہیں تو یہ پھر کسی دوسرے مسئلے سے ہمیں دوچار کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ابھار کر ہماری توجہ اس کی طرف مبذول کر دیتے ہیں اور پھر اس کی آڑ میں کسی دوسرے سندھ دشمن منصوبے پر اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق پیش رفت کر جاتے ہیں۔

یعنی موٹے لفظوں میں یوں کہیے کہ مسائل کا تعین حکمران کرتے ہیں، ہم سندھی اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کس معاملے، کس میدان میں جنگ لڑی جائے، اس کا تعین حکمران کرتے ہیں۔ یعنی کہ سیاسی اصطلاح میں پیش قدمی (Initiative) کی باگ حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اور سیاسی جنگ میں نتائج حاصل کرنے کے حوالے یہ امر انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ پیش قدمی یا Initiative کی قوت کس کے پاس ہے۔ بغور دیکھا جائے تو گزشتہ کچھ عرصے سے ہم من حیث القوم، دفاعی جنگ لڑ رہے ہیں اور ایک محدود اور مختص وقت سے زیادہ دیر تک دفاعی جنگ شکست کا باعث بنتی ہے۔ دنیا بھر میں جتنے بھی سیاسی رہنما اور پارٹیاں ہو گزری ہیں وہ مادی

وسائل کے حوالے سے حکمرانوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہیں۔لیکن باوجود اس کے یہ اکثر حالات میں فتح یاب ہوتی ہیں ۔اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ یہ حکمرانوں سے Initiative چھین لیتی ہیں۔یہ محض حکمرانوں کے کرتوتوں اوران کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کے خلاف ردِعمل ظاہر کرنے کی بجائے ان مسائل کے بنیادی اسباب کا تجزیہ اور تعین کرنے کے بعد ایک مثبت سیاسی پروگرام دیتی ہیں اوراس سیاسی پروگرام یا مقصد کے حصول کی خاطر ایک واضح حکمتِ عملی وضع کی جاتی ہے۔پھر یہ انقلابی افراداس طے شدہ مقصد کے لیے متعین کردہ حکمتِ عملی کے تحت پیش رفت کرتے ہیں جب کہ حکمران اس پیش رفت اور پیش قدمی کو روکنے کی کوششوں میں جوابی اقدامات کرتے ہیں ۔ اس طرح یہ (حکمران) دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اورآخرکارتمام تر مادی وسائل کی موجودگی کے باوجود انھیں شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

1971 میں پارلیمنٹ میں واضح اکثریت ہونے کے باوجود بنگالیوں کوان کے قومی و سیاسی حقوق دینے کی بجائے پاکستان کے حکمرانوں کی طرف سے ان پرفوج کشی کے بعد سندھ کے قومی رہنما سائیں جی،ایم،سید اس نتیجے پر پہنچے کہ سندھ کے تمام مسائل کی جڑ اوراس کا سبب قومی غلامی ہےاوران بار بار اٹھ کھڑے ہونے والے زندگی وموت کے مسائل کا حل قومی آزادی میں پنہاں ہے۔

گویا انھوں نے سندھ کی قومی جدوجہد کے مقصد کا تعین کردیا۔اس کے بعد اگلا مرحلہ تھا قومی آزادی کے اس مقصد کے حصول کے لیے حکمتِ عملی تشکیل دینے کا۔یہ کام اور ذمہ داری ان سب افراد اور تمام جماعتوں کی تھی جو جی،ایم،سید کے اس متعین کردہ مقصد سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔لیکن افسوس کہ تاریخ کی طرف سے عائد کردہ اس ذمہ داری کا کسی نے بھی احساس نہیں کیا۔کچھ عرصہ قبل جی،ایم،سید ہی کی قائم کردہ جماعت ''جئے سندھ محاذ'' نے وقت کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے سید کے قومی آزادی کے مقصد کے حصول کے لیے حکمتِ عملی طے کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ماضی میں چلنے والی اور موجودہ عہد میں جاری قومی آزادی کی تحاریک کا جائزہ لینے اورقومی

ریاستوں کے بارے میں مختلف نظریات کا مطالعہ کرنے اور اکیسویں صدی کے عالمی سیاسی منظر نامے کو بغور دیکھنے کے بعد جئے سندھ محاذ کی سینٹرل کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ تاریخی پس منظر اور موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں سندھ کی قومی آزادی کے حصول کے لیے درست حکمتِ عملی ''حقِ خود ارادیت'' کا راستہ ہے۔ یہ اس لیے اور بھی صحیح اور ناگزیر ٹھہرتا ہے کہ سائیں، جی، ایم، سید عدم تشدد کے فلسفے کے پیروکار تھے اور عدم تشدد کے ذریعے قومی آزادی حاصل کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ عوام کی اکثریت سے فیصلہ لیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں قوم کی اکثریت کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا جائے۔

اس پس منظر اور صورتحال میں تیار کیا گیا سندھ کے لئے ''قومی حقِ خود ارادیت'' کا تھیسس (Thesis) یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

عبدالخالق جونیجو
وائیس چیئرمین
جئے سندھ محاذ

سندھ اور قومی حقِ خودارادیت

انسان شروع میں منتشر، غیر منظم اور غیر مہذب زندگی گزارتا تھا۔ یہ زندگی مکمل طور پر فطرت کے رحم وکرم پر ہوتی تھی۔ سردی، گرمی، بارش طوفان، رعد وبرق، سیلاب، زلزلے اور خطرناک جانور وغیرہ، ان سب کے سامنے انسان خود کو بے بس ولاچار محسوس کرتا تھا۔ اپنی بے بسی ختم کرنے اور بہتر زندگی گزارنے کی کد وکاوش میں انسان نے طویل جدوجہد کی۔ اس جستجو اور جدوجہد میں انسان کو متحد ہونے، مل جل کر رہنے اور منظم ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یوں انسانی تہذیب نے جنم لینا شروع کیا۔ متحد و منظم اور مہذب زندگی گزارنے اور اس زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے انسان کے ہزاروں، لاکھوں سال کا سفر آج بھی جاری وساری ہے۔

متحد و منظم زندگی گزارنے کی اس جستجو اور جدوجہد میں انسانی سماج مختلف اوقات اور مختلف خطوں میں مختلف مراحل سے گزرا ہے اور یہ مختلف شکلیں اختیار کرتا آیا ہے۔ اس وقت تک اس کی سب سے زیادہ منظم شکل ریاست ہے۔ خود ریاست کے بارے میں مختلف وقتوں میں مختلف تصورات رہے ہیں۔ جدید ریاست 18 ویں صدی میں وجود میں آئی جو کہ سرمایہ داری کی ترقی کا

دور ہے اور ریاست کی یہ جدید شکل یورپ بالخصوص مغربی یورپ میں مضبوط ہوئی۔

مغربی یورپ کی ان ریاستوں نے جوں جوں صنعت وتجارت میں ترقی کی، انھیں اپنے ریاستی دائرے محدود محسوس ہونے لگے اور انھوں نے کرۂ ارض کے دیگر حصوں میں اپنے قدم جمانے کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کیے۔ اپنا تیار صنعتی مال فروخت کرنے اور خام مال کے حصول کے لیے انھوں نے دنیا کے دیگر خطوں اور ممالک کا رُخ کیا، البتہ کچھ خطوں، مثلاً ہندوستان میں صورتحال کچھ مختلف تھی۔ ابتدا میں انگریز (اور کچھ دیگر یورپی اقوام) ہندوستان میں تیار مال خرید کر اپنے ممالک میں فروخت کرتے تھے۔ لیکن بعد ازاں یہ آہستہ آہستہ قبضہ کرتے گئے اور صورتحال تبدیل ہوتی چلی گئی اور اس کے نتیجے میں ہندوستان غریب اور انگلستان امیر ہوتا گیا۔ اس کے بعد ہندوستان محض خام مال فراہم کرنے اور تیار مال خریدنے کی منڈی بن گیا۔ ایشیا، افریقہ اور امریکا (برِ اعظم) میں یورپی باشندے پہلے پہل صرف بطورِ تاجر گئے لیکن بعد میں تجارت اور معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے انھوں نے فوج اور دیگر اداروں کو استعمال کرتے ہوئے مختلف ممالک اور قوموں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ یوں دنیا میں اُس سلسلے کا آغاز ہوا جسے کالونائزیشن (Colonization) یا نوآبادیاتی نظام کہا جاتا ہے۔

جدید طرز پر اور طویل منصوبہ بندی کے تحت ایک باقاعدہ نظام کے تحت دنیا کی کالونائزیشن اسی دور میں ہوئی، باقی ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی پہلی بار یورپی اقوام نے دیگر ممالک پر قبضہ کیا یا صرف سرمایہ دار ممالک نے ہی لوٹ کھسوٹ کی۔ دیگر ممالک اور نظاموں جیسے قبائلی اور جاگیرداری نظاموں کے تحت رہنے والے لوگوں نے بھی دیگر لوگوں کے ممالک پر فوجی جارحیتیں کیں اور قبضہ کرتے رہے ہیں۔ مزید برآں کچھ حالتوں میں یہ دیگر ممالک کو اپنے ملکوں کا حصہ بناتے یعنی جبری الحاق کرتے رہے ہیں۔ ویسے تو انسانی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے لیکن ماضی قریب کی کچھ مثالیں جن میں سے کچھ اپنی جان چھڑا چکے ہیں جب کہ کچھ اپنی قومی نجات کے لیے مصروفِ جہد ہیں ان میں کشمیر☆ (ہندستان و پاکستان) اریٹریا (ایتھوپیا) تیمور (انڈونیشیا) مغربی صحارا (

☆ بریکٹ میں وہ نام ہیں جن کے قبضے میں یہ ممالک اور قومیں تھے/ہیں۔

مراکش) اسکاٹ لینڈ (انگلینڈ) وغیرہ شامل ہیں۔

جس وقت انگریز ہندوستان پر قبضہ کر رہے تھے (جس کا آغاز بنگال سے ہوا) اسی عرصے کے دوران انھوں نے سندھ پر بھی قبضہ کیا۔ اُس وقت سندھ ایک الگ ملک تھا جس پر قبضے کے لیے انگریزوں نے الگ سے جنگ کی۔ انگریزوں نے 1843 میں سندھ پر قبضہ کیا اور 1847 میں اس کا بمبئی سے زبردستی الحاق کر دیا۔

جس طرح اٹھارویں اور انیسویں صدی کالونائزیشن یا قبضہ وغلامی کی صدیاں تھیں اسی طرح بیسویں صدی ڈی کالونائزیشن یا آزادی کی تحریکوں کی صدی ثابت ہوئی۔ ایشیا اور افریقہ میں بڑی تعداد میں جب کہ یورپ کی کچھ اقوام میں بھی جو تا حال جبری الحاق کا شکار تھیں، ان سب میں قومی آزادی کی تحریکیں چلیں۔ ان میں سے اکثر وبیشتر تحریکیں کامیابی پر منتج ہوئیں اور بیسویں صدی کے اختتام تک محکوم اقوام کی ایک بڑی اکثریت آزادی سے ہمکنار ہو چکی تھی جب کہ باقی ماندہ کی جدوجہد جاری ہے۔ ان تحریکوں کی ابتدا، تشکیل، ڈھانچوں، جدوجہد کی شکلوں اور آزادی حاصل کرنے کے طریقوں، ان میں محکوم قوم کی تاریخ، جغرافیہ، کلچر، سماجی ڈھانچے اور خطے کے حالات اور عالمی صورتحال اور حاکم ملک کے ریاستی ڈھانچے اور قبضے/الحاق کے لحاظ سے کافی فرق رہا ہے۔ ان میں سے کچھ تحریکیں شروع سے آخر تک مکمل طور پر مسلح تھیں۔ انھوں نے حاکم قوم کے تشدد کا جواب تشدد سے دیا اور بندوق کے بل بوتے پر قائم ریاست کو بندوق کے ذریعے ڈھا کر ایک نئی ریاست تشکیل دی۔ مثال کے طور پر ویت نام اور الجزائر وغیرہ۔ دوسری قسم کی تحریکیں وہ تھیں جو عدم تشدد پر مبنی تھیں اور جن کی سب سے بڑی اور نمایاں مثال ہندوستان ہے۔ ہر چند کہ وہاں بھی سبھاش چندر بوس اور بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی صورت میں پُرتشدد جدوجہد ہوئی، لیکن اہم جدوجہد انڈین نیشنل کانگریس کی تھی جو پُرامن تھی۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی اس حوالے سے منفرد تھی کہ مختلف اسباب کی وجہ سے ہندوستان کے الگ ملک کی حیثیت مسلمہ تھی، جسے انگریز بھی تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ بھی تسلیم شدہ امر تھا کہ ہندوستان غلام ہے جسے ایک دن آزاد ہونا ہے۔ سوال صرف وقت کا تھا جس کا دارومدار تحریک کی مضبوطی اور عالمی صورتحال پر تھا۔ سو جب اندرونی وبیرونی حالات کے سبب

وہ وقت آیا تو انگریزوں نے ہندوستان سے جانے کا فیصلہ کیا اور اپنا بوریا بستر باندھ کر چلتے بنے۔ یوں ہندوستان ہندوستانیوں کے حوالے ہوا۔ لیکن اکثر وبیش تر عدم تشدد کی تحریکوں کا فیصلہ قومی حقِ خودارادیت کا حق استعمال کرنے سے ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے اور مواصلات / میڈیا کی دنیا میں انقلاب برپا ہونے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال نے بھی قومی آزادی کی تحریکوں اور حاکم ممالک کے رویے، کردار اور حکمتِ عملیوں کو کافی متاثر کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کچھ قومی آزادی کی تحریکیں جو شروع تو پُرتشدد طریقے سے ہوئیں لیکن ان کا فیصلہ بندوق کی بجائے حقِ خودارادیت کے استعمال کے ذریعے ہو رہا ہے۔ قومی حقِ خودارادیت کے راستے پر گامزن قوموں اور ممالک میں (مشرقی) تیمور، کیوبک ،مغربی صحارا، اریٹریا اور کشمیر وغیرہ آتے ہیں۔

جس طرح سرمایہ داری کی ترقی سے کالونائزیشن کی ابتدا ہوئی اسی طرح سرمایہ داری کی مزید ترقی ڈی کالونائزیشن کے عمل میں مددگار ثابت ہوئی۔ جب سرمایہ داری بڑھنے لگی ،یعنی مغربی یورپی ممالک نے صنعت اور تجارت میں ترقی کی تو انھیں کالونیوں کی ضرورت پڑی اور مختلف یورپی ممالک نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک پر قبضہ کیا۔ کیوں کہ ان کے اپنے ممالک کی مارکیٹ ان کے لیے چھوٹی پڑ گئی تھی۔ پھر جب انھوں نے مزید ترقی کی تو انھیں اپنی کالونیاں بھی مختصر محسوس ہونے لگیں، اس لیے انھیں ایک دوسرے کی کالونیوں پر قبضہ کرنے اور اس مقصد کے لیے ایک دوسرے کو کمزور کرنے کی حاجت پڑی۔ اس طرح عالمی جنگیں ہوئیں۔ دونوں عالم گیر جنگوں میں جرمنی پیش پیش تھا۔ اس کی بھی سب سے اہم وجہ یہی کالونیوں کا سوال تھا۔ صورتحال یہ تھی کہ ہالینڈ اور بلجیم جیسے چھوٹے ممالک کی بھی کالونیاں تھیں جب کہ یورپ کا سب سے بڑا ملک جرمنی اس معاملے میں تہی دست تھا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ یورپ اور ایشیا میں پھیلا ہوا ملک ترکی بھی اسلامی خلافت کے نام پر متعدد ممالک پر قابض تھا۔ بعدازاں جب یورپ کی حاکم اقوام کے درمیان ایک دوسرے کو کمزور کرنے کے لیے جنگیں ہوئیں تو اس سے محکوم اقوام کی آزادی کی تحریکوں کو مدد ملی۔ اس طرح پہلی عالم گیر جنگ کے بعد ڈی کالونائزیشن یا نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے

عمل کی ابتدا ہوئی۔ جب کہ دوسری عالم گیر جنگ کے نتیجے میں یہ عمل کافی تیز ہوا اور یکے بعد دیگرے اقوام اور ممالک کی آزادی کا سلسلہ شروع ہوا۔

دوسری عالم گیر جنگ کے نتیجے میں اقوام متحدہ کا ادارہ وجود میں آیا۔ شروع میں اس ادارے میں ایک بڑی اکثریت انہی "حاکم" ممالک کی تھی لیکن پھر جوں جوں غلام آزاد ہوتے گئے ویسے ویسے اس ادارے میں آزادی پسند ممالک کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور "حاکم" ممالک کا تناسب بھی گھٹتا رہا۔ غلامی کا جوا اتار پھینک کر آنے والے ان نو آزاد ممالک کی مدد سے اقوامِ متحدہ نے شہری اور سیاسی حقوق کا تاریخی عہد نامہ منظور کیا جس میں دنیا کی تمام اقوام کے لیے خود ارادیت کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ 16 دسمبر 1966 کو پاس ہونے والے اور 1976 سے لاگو ہونے والے اس عہد نامے کے آرٹیکل نمبر 1 میں کہا گیا ہے کہ "تمام اقوام کو حقِ خود ارادیت حاصل ہے۔ یہ حق انھیں اختیار دیتا ہے کہ یہ اپنی آزادانہ رائے سے اپنی سیاسی حیثیت کا تعین کریں اور اپنی مرضی سے اقتصادی، سماجی اور ثقافتی ترقی کے راستے کا تعین کریں۔"

بیسویں صدی میں جب قومی آزادی کی ہواؤں نے کرۂ ارض کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لیا تو سندھ بھی اپنی بحالی اور نجات کے لیے حرکت میں آیا۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ سندھ 1843 میں انگریزوں کے قبضے کے باعث ایک خود مختار ملک سے صوبہ بنا اور بعد ازاں 1847 میں اس کی صوبائی حیثیت کو بھی ختم کرتے ہوئے اسے بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ بنایا گیا تو سندھ نے اپنی از سرِ نو بیداری اور بحالی کے راستے پر چلتے ہوئے صوبائی حیثیت کے حصول کے لیے تحریک چلائی جس کے نتیجے میں یکم اپریل 1936 کو سندھ کی صوبائی حیثیت بحال ہوئی۔ اس تناظر میں ایک مضبوط اور طاقت ور دلیل یہ بھی ہے کہ سندھ کو صوبائی نہیں بلکہ اپنی ملکی حیثیت کی بحالی کی تحریک چلانا چاہیے تھی۔ اس وقت یہ انگریز حکمرانوں کا بھی فرض تھا کہ انھوں نے جس (ملکی) حیثیت میں سندھ پر قبضہ کیا تھا تو اسی حیثیت سے اسے سندھیوں کو واپس کرتے۔ لیکن اس مرحلے پر دنیا پر قابض سامراجی طاقتوں کو یہ محسوس ہونے اور نظر آنے لگا تھا کہ اب ان کا کالونیل یا نوآبادیاتی نظام زیادہ عرصے تک نہیں چل سکے گا، اس لیے انھوں نے آنے والے وقت میں اپنے مفادات کے

تحفظ کی خاطر نیوکالونیل ازم (Neo-Colonialism) یا جدید نوآبادیاتی نظام کی منصوبہ بندی شروع کردی جس کے تحت بلاواسطہ طور پر دنیا کو اپنے کنٹرول میں رکھنا تھا۔ اس منصوبے کے تحت انھوں نے اپنی خالی کردہ نوآبادیوں کی اس طرح تشکیل اور تقسیم کی اور ایسے افراد اور گروہوں کو اقتدار منتقل کرنے کی کوشش کی تاکہ آنے والے وقت میں ان کا اثر و رسوخ برقرار رہے۔ کچھ حالات میں تو یہ چھوٹے چھوٹے محکوم ممالک کو ایسے طاقتور ممالک کے حوالے کر گئے جو ان کے تسلیم شدہ وفادار تھے۔ اگر کہیں ایسے ممالک نہ تھے تو وہاں انھوں نے یہ تخلیق کیے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے دوسری عالم گیر جنگ کے بعد وجود میں آنے والے اقوامِ متحدہ کے ادارے کو بھی استعمال کیا۔ اس طرح کی سازشوں کا شکار ہونے والی اقوام میں اریٹریا (ایتھوپیا) فلسطین (برطانیہ۔ اسرائیل) اور سندھ (پاکستان) شامل ہیں۔☆

روبہ زوال عالمی سامراجی طاقت برطانیہ اور ابھرتی ہوئی عالمی قوت امریکا اور اس کے مقامی ساتھیوں کے مشترکہ مفادات کی خاطر برِ صغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پاکستان وجود میں لایا گیا۔ سندھ کو پاکستان کے ساتھ شامل تو کیا گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے فوجی چڑھائی کے ذریعے فتح نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے لیے ایک سیاسی دستاویز کو بنیاد قرار دیا گیا۔

یہ سیاسی دستاویز مسلم لیگ کی 1940 میں پاس کی گئی مشہورِ زمانہ قراردادِ لاہور ہے اور پاکستان کو اس قرارداد کا نتیجہ قرار دینے کے لیے ہی اس کا عنوان ''قراردادِ لاہور'' سے تبدیل کرتے ہوئے ''قراردادِ پاکستان'' رکھا گیا۔

سندھ کی پاکستان میں شمولیت کی بنیاد اور جواز بھی یہی 1940 کی قرارداد ہے جس کی حمایت سندھ اسمبلی نے 3 مارچ 1943 کو کی تھی۔ البتہ جس طریقے سے سندھ اسمبلی سے یہ قرارداد پاس کی گئی وہ خود اپنی جگہ ایک متنازع مسئلہ ہے۔ اس وقت سندھ اسمبلی میں ممبران کی کل تعداد 60 تھی۔ چونکہ ان دنوں ہندوستان میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' (Quit India) تحریک چل رہی تھی اس لیے کانگریس کے حامی ممبر یا تو جیلوں میں تھے یا روپوش جبکہ کچھ ممبران روایتی طور پر غیر

☆ قوسین میں ان ممالک کے نام ہیں جن کے کنٹرول میں ان اقوام کو دیا گیا۔

حاضر تھے۔ یوں مقرر کردہ اجلاس میں 60 میں سے 28 ممبر حاضر تھے جن میں سے 24 نے قرار داد کے حق میں ووٹ دیا۔ ممبران کا یہ تناسب معمول کی قانون سازی اور روایتی قراردادوں کے لیے تو پورا ہے لیکن اہم اور غیر معمولی فیصلوں کے لیے یہ بالکل ہی نامکمل ہے۔ پاکستان سمیت دنیا کے کسی بھی ملک کے آئین میں ترمیم کرنے کے لیے بھی کُل ممبران کے 2/3 والے اصول کا اطلاق کیا جاتا ہے تو سندھ کے پاکستان کے ساتھ اکھٹے رہنے کے لیے 40 ممبران کے تائیدی ووٹوں کا ہونا لازم تھا جبکہ عملی صورت یہ تھی کہ 60 میں سے 24 نے اس کی تائید میں ووٹ دیا جو کہ 40 فی صد بنتا ہے۔

صرف سندھ ہی نہیں بلکہ پختونخوا اور بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے طریقہ کار پر بھی بڑے سوالیہ نشان ہیں۔ برِ صغیر کی تقسیم کے وقت پختونخوا میں انڈین نیشنل کانگریس کے حامی خدائی خدمت گاروں کو اکثریت حاصل تھی۔ اس لیے اسمبلی سے فیصلہ لینے کی بجائے اسمبلی کو توڑ کر عوامی ریفرنڈم کا اعلان کیا گیا۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ پختونخوا کے عوام پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں۔ خان عبدالغفار خان کی قیادت میں خدائی خدمت گاروں نے مطالبہ کیا کہ ریفرنڈم میں تیسرا نکتہ (Third Option) بھی رکھا جائے کہ کیا پختونخوا کے عوام آزاد رہنا چاہتے ہیں؟۔ یہ نکتہ شامل نہ کیے جانے پر خطے کی سب سے مقبول عوامی جماعت خدائی خدمت گار نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا، جب کہ سوات، دیر اور قبائلی علاقوں کو ریفرنڈم میں شریک ہی نہیں کیا گیا۔ اس طرح مرکزی سرکار کے تحت ہونے والا یہ ریفرنڈم ایک دکھاوے کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

بلوچستان کے معاملے میں پاکستانی ریاست کا کردار اور بھی زیادہ خراب ہے۔ انگریزوں کے دور میں موجودہ بلوچستان مختلف ریاستوں میں منقسم تھا لیکن قلات کی ریاست کو بلوچوں کی قومی یک جہتی اور شناخت کی علامت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت ریاست قلات کی آئینی حیثیت ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے مختلف تھی۔ انگریزوں کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے منسلک ہونے کے باوجود ریاست قلات آزاد اور خود مختار تھی۔ اس حیثیت کا اقرار 14 اگست 1947 کے سہہ فریقی معاہدے میں بھی کیا گیا جو انگریز حکومت، پاکستان اور قلات ریاست کے درمیان ہوا۔ اس معاہدے میں انگریزوں اور قلات کے درمیان ہونے والے

معاہدے کے لیے پاکستان کو عارضی جانشین تسلیم کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ اس معاہدے کی حیثیت کے بارے میں قانونی رائے لی جائے گی اور پاکستانی ریاست اور ریاست قلات کے درمیان تعلقات کے بارے میں ''دوستانہ'' ماحول میں مذاکرات ہوں گے۔ یکم اگست 1947 کو ریاست قلات کا آئین عمل میں آیا اور 15 اگست کو خان آف قلات کی طرف سے آزاد ریاست کا اعلان کیا گیا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد دونوں ریاستوں میں ''دوستانہ'' مذاکرات شروع کرنے کی بجائے پاکستان کی طرف سے الحاق کے لیے دباؤ بڑھ گیا جسے قلات کے دونوں ایوانوں (دازالامراء اور دارالعوام) نے ردکردیا۔ لیکن پاکستان کی ریاست کی طرف سے مختلف سازشوں اور فوجی طاقت کے استعمال کی دھمکیوں کے ذریعے خان آف قلات سے الحاق کا اعلان کرایا گیا ۔ 31 مارچ 1948 کو ہونے والے اس ''معاہدے'' کے تحت خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے حکومتِ پاکستان کے حوالے کیے گئے اور یہ طے پایا کہ آئندہ اس معاہدے میں تبدیلی صرف دونوں فریقین کی رضامندی سے ہوگی۔ لیکن اس معاہدے کے محض دو ہفتے بعد 15 اپریل 1948 کو اسے لانگ بوٹوں تلے روندھتے ہوئے پاکستان کی حکومت نے ریاست قلات کے تمام تر اختیارات یک طرفہ طور پر اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور آزادی پسند رہنماؤں کو قید و بند اور جرمانوں کی سزائیں دے کر خوف و دہشت کا ماحول پیدا کیا گیا۔ 63 سال کے دوران مختلف ناموں اور نعروں کے تحت تبدیلیوں کے باوجود عملی صورتحال آج بھی جوں کی توں ہے۔

پاکستان کے ساتھ سندھ کی جڑت کی بنیاد بننے والی 1940 کی قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ''۔۔۔ وہ علاقے جہاں مسلمان عددی طور پر اکثریت میں ہیں، جیسے انڈیا کے شمال۔ مغرب اور مشرقی حصوں میں، انھیں ملا کر آزاد ریاستیں بنائی جائیں جن میں (ان ریاستوں کے) بنانے والے یونٹ آزاد اور خودمختار ہوں گے۔'' اس کے بعد جب انگریزوں کے برِصغیر سے جانے کے دن قریب آئے تو اس خطے میں رہنے والے مختلف مذاہب اور قوموں/ریاستوں کے مسائل کا آئینی حل نکالنے کے لیے کیبنٹ مشن کو ہندوستان بھیجا گیا۔ اس مشن کے سامنے 12 مئی 1946 کو مسلم لیگ کی طرف سے صلح کے لیے جو شرائط رکھی گئیں ان میں موضوع سے متعلقہ نکات کچھ یوں ہیں۔

نکتہ نمبر 2: مذکورہ چھ مسلم صوبوں☆ کے لیے جدا آئین ساز ادارہ تشکیل دیا جائے گا جو (صوبوں کے) گروپوں کے لیے اور صوبوں کے لیے (جدا) آئین بنائیگا جو کہ ان محکموں (Subjects) کا تعین کرے گا جو صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے پاس ہوں گے۔ جب کہ رہ جانے والے (Residuary) تمام امور کا اختیار صوبوں کے پاس ہوگا۔

نکتہ نمبر 4: آئین ساز ادارے کی طرف سے پاکستان کی وفاقی حکومت اور صوبوں کے آئینوں کو حتمی شکل دینے کے بعد ہر صوبے کی مرضی پر منحصر ہوگا کہ (اگر وہ چاہے تو) متعلقہ گروپ سے علیحدگی اختیار کر سکے گا۔ بشرطیکہ ایک ریفرنڈم کے ذریعے اس صوبے کے عوام کی رائے معلوم کی جائے کہ یہ گروپ سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔"

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ وہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک مسلم لیگ نئے علیحدہ ملک بنانے کا مطالبہ کر رہی تھی اس حد تک وہ عدم مرکزیت کی حامی تھی اور متوقع ملک کا جو آئینی خاکہ وہ پیش کر رہی تھی وہ فیڈریشن سے زیادہ ایک کنفیڈریشن کا تھا، لیکن جوں ہی پاکستان کی ریاست قائم ہوئی اس کے حکمرانوں نے 180 ڈگری کی قلا بازی کھائی اور پاکستان ایک انتہائی مرکزیت پسند ملک بن گیا۔ بلوچستان کی مختصر مثال سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگست 1947 میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست کو کس طرح چند ماہ میں ایک محتاج خطہ بنایا گیا جس کی قومی خود مختاری تو دور کی بات مرکز نے صوبائی خود مختاری بھی چھین کر سارے اختیارات اپنے پاس رکھ لیے۔

سندھ کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی کہانی بھی کوئی مختلف نہیں ہے۔ جس کنفیڈریشن کا وعدہ کیا گیا تھا وہ تو دور کی بات کہ فیڈریشن بھی عنقا تھی۔ یہاں تو ایک معقول وجدانی حکومت سے بھی کہیں آگے بات آمریت تک جا پہنچی۔ پہلے گورنر جنرل سے لے کر جو بھی حکمران آئے ہیں انھوں نے آمرانہ طریقوں اور ہتھکنڈوں سے حکومت چلائی ہے۔ حاکمِ وقت کی زبان سے نکلے لفظ سندھ کے باشندوں کے لیے گویا کاتبِ تقدیر کا لکھا قرار دیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے لیے سندھ کے ادا کیے گئے کردار کے عوض پاکستان بننے کے بعد پہلا

پنجاب، سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام)

تحفہ سندھ کو یہ دیا گیا کہ دارالحکومت اور صنعتی شہر کراچی سندھ سے چھین کر مرکز کی ملکیت بنا دیا گیا۔ کراچی سے سندھی زبان کو دیس نکالا دیا گیا، سندھی میڈیم اسکول بند کیے گئے اور سندھ یونیورسٹی کو حیدرآباد منتقل کر کے الگ سے کراچی یونیورسٹی قائم کی گئی جس میں سندھی طلبا پر داخلے کے دروازے بند کیے گئے۔ سندھ کی آبادی کے ایک بڑے حصے (تقریباً 25فی صد) کو جن میں اعلا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ، تاجر اور ہنر مند شامل تھے، مذہب کی آڑ میں سندھ بدر کیا گیا اور ان کی جگہ ہندوستان سے اور پاکستان کے دیگر صوبوں سے لوگ لا کر آباد کیے گئے۔ ان کی ایک بڑی اکثریت کو سندھ کے شہروں میں ٹھہرایا گیا جس سے سندھی باشندوں کے شہروں کی طرف آنے اور ترقی کرنے کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ آزادی کے نام پر قائم کیا جانے والا ملک پاکستان ایک نوآبادیاتی (Colonial) ریاست کی شکل اختیار کرتا گیا جس میں سندھ اور سندھیوں کے مال ملکیت پر قبضہ ہوتا گیا۔ سندھ کی بہترین زمینیں، سندھ کے کارخانے، سندھ کی تجارت، سندھ کے اعلا تعلیمی ادارے سب غیر سندھیوں کے حوالے کیے گئے۔ اقتصادی شہ رگ کی حیثیت رکھنے والی اور خطے میں تزویراتی (Strategically) اہمیت کی حامل کراچی بندرگاہ سندھیوں سے چھین لی گئی۔ مزید برآں جب تیل اور گیس کے ذخائر دریافت ہوئے تو ان پر مرکزی حکومت نے قبضہ کر لیا جبکہ کہ نو دریافت شدہ اور دنیا کے پانچویں بڑے کوئلے کے ذخیرے پر قبضے کی کوششیں جاری ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ سندھیوں کو اپنی ہی سرزمین پر اقلیت میں تبدیل کر کے دوسرے درجے کا شہری بنانے کے لیے آئینی اور غیر آئینی طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں اور بندوق و مذہب کا ہتھیار استعمال کیا جا رہا ہے۔ مذہب کے نام پر کی گئی تقسیم کی آڑ میں نقل مکانی ہو، مذہب کے نعرے کے تحت شروع کی گئی کشمیر یا افغانستان کی جنگ ہو، یا پھر "مذہبی بنیاد پرستی" کے "خلاف" جنگ ہو، ان سب کے نتیجے میں لوگوں کی ایک بڑی اور لامتناہی تعداد سندھ میں آباد ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں سندھ میں غربت اور بے روزگاری بڑھنے کے علاوہ سندھ کا تاریخی سیکولر، پرامن، بھائی چارے اور رواداری کا کردار تبدیل ہو رہا ہے اور سندھ نسلی اور مذہبی جھگڑوں اور دہشت گردی کی آماجگاہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ پاکستانی ریاست کی دین ہے۔ اور یہ بات گزشتہ 63 سال کے دوران ناقابلِ

تردید حد تک ثابت ہو چکی ہے کہ روزِ اول سے لے کر اس ریاست پر پنجاب کا مکمل اختیار اور بالا دستی ہے۔ سارے فیصلے پنجاب کی مرضی سے اور پنجاب کے مفاد میں کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب، سندھ، پختونخوا، بلوچستان اور بھاولپور کو ضم کر کے ون یونٹ کی شکل میں مغربی پاکستان کا مصنوعی صوبہ بنایا گیا۔ سندھ، پختونخوا، بلوچستان اور بھاولپور، ان سب نے ون یونٹ کی سخت مخالفت کی تو باقی کون بچا جس کا مفاد ون یونٹ سے وابستہ تھا؟۔ یہ پنجاب ہی تھا کیوں کہ ریاستی اداروں، فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ پر پنجاب کا غلبہ تھا، اس لیے ون یونٹ بن گیا اور پھر یہ کہا گیا کہ ایسا کرنا ''ملک کے مفاد'' میں تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو پنجاب کے مفادات ہیں وہی ملک کے مفادات ہیں۔

دوسری طرف اسی ون یونٹ کی شکل میں پنجاب کی بالادستی والے مغربی پاکستان کو ملک کی سب سے بڑی اور سب سے ذہین قوم بنگالیوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ مشرقی بنگال کا نام مٹا کر مشرقی پاکستان رکھا گیا اور پھر ملک کا آئین اور قانون اس بنیاد پر بنایا گیا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان برابر ہیں۔ یعنی Parity کا اصول لاگو کیا گیا۔ دنیا بھر کی ریاضی پر کالک ملتے ہوئے یہ کہا گیا کہ 54 فی صد اور 46 فی صد برابر ہیں، کیوں کہ اس میں پنجاب کا مفاد تھا اور پنجاب کی مرضی تھی۔ پھر جب پاکستانی ریاست کے غیر مساوی اور نوآبادیاتی رویوں سے بیزار ہو کر بنگالی الگ ہو گئے تو فوراً قلابازی کھاتے ہوئے کہا گیا کہ ''اب اکثریت کا قانون چلے گا کیوں کہ اکثریت ہی اصل جمہوریت ہے۔'' اور پھر (پنجاب کی) اکثریت کی بالادستی قائم رکھنے کی خاطر 1973 کا مشہورِ زمانہ آئین لاگو کیا گیا (ہر چند کہ پنجاب کی بالادستی کا واحد سبب اس کی اکثریت نہیں ہے) ۔ یہ آئین لاگو کرتے وقت کہا گیا (اور آج تک کہا جاتا ہے) کہ ''یہ بہترین ملکی مفاد میں ہے۔'' جب 1956 کا برابری (Parity) پر مبنی آئین نافذ کیا گیا تو اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ ''یہ بہترین ملکی مفاد میں ہے۔'' اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت برابری پنجاب کے مفاد میں تھی جب کہ اب اکثریت میں پنجاب کا مفاد ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ 1980 کی دہائی میں جب سندھی، بلوچ، پختون فرنٹ بنا اور اس نے مطالبہ کیا کہ ملکی آئین سندھ، بلوچستان، پختونخوا اور پنجاب کے درمیان برابری

(Parity) کی بنیاد پر بنایا جائے تو ریاست کی طرف سے کہا گیا کہ یہ ملک کے ساتھ غداری ہے اور فرنٹ کے رہنماؤں کے خلاف بغاوت کے کیس داخل کیے گئے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ پاکستان کا 1973 کا آئین اور سندھی، بلوچ، پختون فرنٹ کا آئین بنانے والا ایک ہی شخص تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی حالیہ تاریخ کا سب سے متنازع منصوبہ کالا باغ ڈیم: 3 یونٹ سندھ، پختونخوا اور بلوچستان اس کے شدید مخالف ہیں جب کہ پنجاب یہ ڈیم بنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ''کالا باغ ڈیم بنانا ملک کے مفاد میں ہے۔'' یعنی کہ پنجاب اور پاکستان ایک ہی بات ہے۔ اس سے حکمران یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ سندھ، بلوچستان اور پختونخوا کے مفادات پاکستان کے مفادات سے جدا ہیں۔

پاکستان کی ریاست پر پنجاب کی بالادستی اور حاکمیت کی ایک اور مثال جو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی 63 سالہ زندگی میں اس ریاست کی طرف سے بنگالیوں، سندھیوں، پختونوں اور بلوچوں کو باری باری ''غدار'' قرار دیا گیا لیکن پنجابیوں کے لیے یہ خطاب کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اب ریاست کو بھی کوئی فرشتے تو نہیں چلا رہے، لوگ ہی چلا رہے ہیں۔ تو پھر لوگ وہی بچے جو غداری کے الزام سے مبرا ہیں، نہ صرف خود الزام سے مبرا ہیں بلکہ دوسروں کے ملک سے غداری اور وفاداری کے سرٹیفیکٹ جاری کرتے رہتے ہیں۔ مزید برآں حیرت کی بات یہ ہے کہ بنگالیوں، سندھیوں، پختونوں، بلوچوں اور پنجابیوں میں پنجابی ہی تھے جنھوں نے پاکستان بنانے کی جدوجہد میں سب سے کم کردار ادا کیا اور انگریزوں کو سب سے زیادی وفادار مہیا کیے۔ 1970 میں ہونے والے پاکستان کے واحد جمہوری الیکشن کے نتیجے میں بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل کی قیادت میں عوام کی منتخب نیپ (NAP) حکومت قائم ہوئی اس حکومت نے اپنے انتخابی پروگرام پر عمل کرتے ہوئے مقامی لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرنے کی خاطر غیر بلوچ ملازمین کو ان کے صوبوں میں واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ ان ملازمتوں میں بڑی اکثریت پنجاب کے باشندوں کی تھی۔ اس پر غصے میں آ کر مرکزی حکومت نے صوبائی حکومت کو ڈسمس کیا، اسمبلی کو معطل کیا اور عوام کے منتخب راہنماؤں کو سردار عطاء اللہ مینگل سمیت بغاوت کا الزام لگاتے ہوئے جیل میں

ڈال دیا۔ دوسری طرف 1988 کے انتخابات کے بعد پنجاب میں مسلم لیگی میاں نواز شریف وزیرِ اعلیٰ بنے جب کہ مرکز میں سندھ سے تعلق رکھنے والی بے نظیر بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ میاں نواز شریف کی صوبائی حکومت نے مرکزی حکومت سے جو برتاؤ کیا وہ سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت کے مقابلے میں کہیں زیادہ سرکشی کا تھا۔ پنجاب حکومت نے مرکزی حکومت کے احکامات ماننے سے انکار کردیا۔ سارے فیصلے لاہور میں ہونے لگے، پنجاب بینک قائم کیا گیا، پنجاب ٹیلی ویژن شروع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جب کہ وزیراعظم مرکزی حکومت کے ترقیاتی منصوبوں کا افتتاح کرنے کے لیے بھی پنجاب نہیں جاسکتی تھی۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ پنجاب پولیس نے راولپنڈی میں قائم وزیراعظم ہاؤس پر "مجرموں کی تلاش" کے لیے چھاپہ مارا اور وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے خود کو بچانے کے لیے اسلام آباد میں واقع سندھ ہاؤس میں پناہ لی اور کچھ عرصے تک وہاں سے حکومت کا نظم و نسق چلایا۔ یعنی اسلام آباد کے مقابلے میں لاہور میں ایک متوازی (Parallel) حکومت قائم تھی۔ لیکن نہ تو کسی نے نواز شریف کو غدار کہا اور نہ ہی کسی کو اس کی حکومت کے خلاف کارروائی کرنے کی ہمت ہوئی بلکہ سب کچھ اس کے برعکس ہوا یعنی بے نظیر بھٹو کی مرکزی حکومت کو مختلف الزامات کے تحت ختم کیا گیا اور نتیجے میں ہونے والے انتخابات کے ذریعے نواز شریف کو ترقی دیکر وزیراعظم بنادیا گیا۔

مہذب دنیا میں مختلف لوگوں کے ایک ریاست میں رہنے کی بنیاد اور جواز ایک سماجی معاہدہ ہوتا ہے جسے آئین کہا جاتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ رہنے، ملکر چلنے اور ترقی کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس سماجی معاہدے پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے۔ اور پھر پاکستان جیسا ملک جو وجود ہی ایک معاہدے (قراردادِ لاہور 1940) کے تحت آیا ہو اسے چلانے کے لیے تو اس معاہدے پر عمل کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہوجاتا ہے۔ لیکن یہاں ہوا سب اس کے برعکس ہی ہے۔ یہاں ایک معاہدہ نہیں بلکہ کتنے ہی معاہدے توڑے گئے ہیں بلکہ ایک کو چھوڑ کر باقی سارے معاہدے یک طرفہ طور پر کیے گئے اور یک طرفہ طور پر ہی توڑے گئے۔

سب سے پہلے پاکستان کی بنیاد سمجھا جانے والا معاہدہ یعنی 1940 کی قرارداد۔ یہ

معاہدہ جو پاکستان میں شامل ہونے والی قوموں کے رہنماؤں نے اپنی آزادانہ رائے سے کیا تھا اس میں جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، لکھا ہے کہ ''ملک بنانے والے یونٹ آزاد اور خودمختار ہوں گے۔''
مرکزیت پسند یا باالفاظِ دیگر پاکستانی ریاست کے ''والی وارث'' کہتے ہیں کہ 1946 میں اس قرار دار میں ترمیم کی گئی تھی اس لیے اب اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ بالکل غلط اور بے سروپا بات ہے۔ 1946 کی جس قرارداد کا حوالہ دیا جاتا ہے اس کا قراردادِ لاہور سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک بالکل دوسری قرارداد ہے جسے ایک دوسرے ادارے نے منظور کیا ہے۔ 1940 کی قرارداد آل انڈیا مسلم لیگ کی جنرل کونسل نے پاس کی تھی جبکہ 1946 کی قرارداد اسمبلی ممبران کی طرف سے پاس کردہ ہے۔

پارٹی ٹکٹ پر منتخب چند اسمبلی ممبران، پارٹی کے سارے ملک سے اکھٹے ہونے والے نمائندوں کے طے کردہ معاملات میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے تبدیلی کی بھی نہیں تھی۔ لیکن اگر دلیل کے طور پر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ تبدیلی کی گئی تھی تو پھر یہ 1940 کی اس معاہدے کی خلاف ورزی تھی جس کے تحت سندھ نے نئے بننے والے ملک میں شامل ہونے کی حامی بھری تھی۔ گویا ایک ملک میں اکھٹے رہنے کے لیے کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی اس ملک کے قیام سے قبل ہی کی گئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوال ہے کہ اگر 1940 کی قرارداد قیام پاکستان سے قبل ہی تبدیل ہوگئی تھی تو پھر پاکستان کے بننے کے کافی عرصے بعد بننے والے مینارِ پاکستان پر یہ کیوں تحریر ہے؟ اور آج تک پاکستان سرکار 23 مارچ کو کیوں قومی دن کے طور پر مناتی آ رہی ہے۔ بہر کیف ترمیم ہوئی یا نہیں اس سے قطع نظر حکمران طبقات کی جانب سے اس طرح کا موقف اختیار کرنا بتاتا ہے کہ ان کے نزدیک معاہدوں کی کوئی اہمیت نہیں، اگر اہمیت ہے تو ان کے اپنے مستقل مفاد کی ہے۔

پاکستان انڈین انڈپینڈنس ایکٹ کے تحت قائم ہوا لیکن قائم ہوتے ہی اس ریاست نے اس ''معاہدے'' کو بھی توڑا جس نے اسے وجود بخشا تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اس ایکٹ میں جنرل سیلز ٹیکس صوبوں کے پاس تھا، لیکن پاکستان بنتے کے ساتھ یہ کہہ کر ایک سال کے لیے مرکز کے

حوالے کیا گیا کہ مہاجرین کی نقل مکانی اور دیگر مسائل کے سبب ملک ہنگامی حالات سے گزر رہا ہے ۔ یہ "ایک سال" 63 سال گزر جانے کے باوجود تا حال مکمل نہیں ہوسکا ہے۔

اس کے بعد 1956 کا "سماجی معاہدہ" (آئین) آیا جس میں ون یونٹ تھا اور 54 فیصد (مشرقی پاکستان) اور 46 فیصد (مغربی پاکستان) برابر قرار دیے گئے تھے۔ کہا گیا کہ "یہ بہترین ملکی مفاد میں ہے۔" اس کے محض دو سال بعد 1958 میں اسے ختم کرتے ہوئے مارشل لاء لگایا گیا "بہترین ملکی مفاد میں"۔ پھر 1962 میں ایک آئین نافذ کیا گیا جسے 7 سال بعد 1969 میں دوسرے مارشل لاء کے ذریعے ختم کیا گیا اور پھر آیا 1973 کا آئین جس کا جشن منایا گیا کہ یہ متفقہ طور پر منظور کیا گیا تھا۔ (جو درحقیقت متفقہ نہیں تھا کیوں کہ 4 میں سے 1 یونٹ بلوچستان سے ممبران کی اکثریت نے اس پر دستخط نہیں کیے تھے) اس "متفقہ" آئین کا جو حشر کیا گیا اور جس طرح کیا گیا ہے، مہذب ممالک میں ایسی تذلیل روایتی قانون کی بھی نہیں کی جاتی ہے۔ جبکہ آئین کی وصف یہ ہے کہ یہ ملک کا بنیادی قانون (Basic Law of The Land) ہوتا ہے۔ اس کے بانی ذوالفقار علی بھٹو سے لیکر سارے حکمرانوں نے اپنی ذاتی منشاء اور مفادات کے مطابق اس کی اتنی چھیڑ پھاڑ کی ہے کہ اسے 73 کا آئین کہنا ایک بڑا جھوٹ لگتا ہے۔ ایک فوجی جرنیل محمد ضیاء الحق نے تو بندوق بدست یہ بھی کہا کہ "آئین کی کیا حیثیت ہے، یہ محض کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جسے میں چاہوں تو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دوں۔" (اور یہ الفاظ کہنے والا پھر پاکستان کی تاریخ کا سب سے طویل عرصے تک رہنے والا حکمران رہا ہے)

یک طرفہ معاہدے کرنے اور توڑنے کی ایک مثال پانی کا معاہدہ بھی ہے۔ سندھ اور پنجاب کے درمیان نہروں کے پانی پر جھگڑا تقریباً ڈیڑھ صدی سے چلتا آ رہا ہے۔ 1991 میں پاکستان سرکار نے اپنے ایک مسلط کردہ وزیر اعلیٰ کے ذریعے سندھ کا پنجاب کے ساتھ ایک معاہدہ کرایا۔ سندھی قوم نے اس معاہدے کی مخالفت کی لیکن حکومت کی طرف سے کہا گیا کہ "یہی ممکنہ بہترین معاہدہ ہے۔" 20 سال گزرنے کے باوجود اس پر عمل نہیں ہوا ہے اور اگر سندھ حکومت عمل درآمد کا مطالبہ کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ "اس معاہدے پر عمل نہیں ہوسکتا۔"

پاکستان کی ریاستی تشکیل میں سندھ کی کیا حیثیت ہے اس کو سمجھنے کی سب سے اہم اور آسان مثال سندھ اسمبلی ہے۔ حکمرانوں کے اپنے بنائے گئے قوانین اور مقرر کردہ معیارات کے مطابق سندھی عوام کی رائے سے منتخب اس ایوان کی حیثیت اسلام آباد کی حکومت میں بیٹھے ایک ڈپٹی سیکریٹری سے بھی کم ہے۔ 1972 میں سندھ اسمبلی نے 80 فیصد کی اکثریت سے سندھی زبان کا بل پاس کیا تو اسلام آباد سے آرڈی ننس جاری کر کے اس بل کو تبدیل کیا گیا، کالا باغ ڈیم اور گریٹر تھل کینال کے خلاف سندھ اسمبلی متعدد بار متفقہ طور پر پاس کردہ قرارداد کے ذریعے انھیں سندھ دشمن منصوبے قرار دیتے ہوئے ان کے خاتمے کا مطالبہ کر چکی ہے۔ سندھی قوم کے اس متفقہ فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے پاکستان سرکار گریٹر تھل کینال بنا چکی ہے اور کالا باغ ڈیم بنانے کی تیاریاں جاری ہیں۔ اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ان دونوں منصوبوں کو پنجاب کی حمایت حاصل ہے۔ اسی طرح بلوچستان اسمبلی بھی متفقہ رائے سے مطالبہ کر چکی ہے کہ مری، بگٹی علاقوں اور گوادر میں فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر بند کی جائے، لیکن یہ تعمیر جاری ہے۔

تاریخ پر نظر رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ انگریز کی نوآبادیاتی حکومت بھی بالکل اسی طرح چلتی تھی۔ ہندوستانی باشندوں کی اسمبلیاں (اور دیگر ادارے) صرف معاملات پر بحث کر کے مشورہ دے سکتی تھیں۔ فیصلے دہلی میں بیٹھے ہوئے انگریز حکمران کرتے تھے اور تمام تر اختیارات انہی کے پاس ہوتے تھے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان ایک نوآبادیاتی ریاست ہے جو 1947 سے قبل کی انگریز حکومت کا تسلسل ہے اور سندھ اس میں نوآبادی بن چکا ہے، جس کی اپنی کوئی بھی حیثیت نہیں اور اس کی تقدیر کے فیصلے اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ پاکستانی ریاست میں طاقت کا اصلی مرکز اسلام آباد نہیں بلکہ لاہور ہے۔ بالفاظِ دیگر سندھ پنجاب کی نوآبادی بن چکا ہے اور یہ عالمگیر حقیقت ہے کہ نوآبادیت (Colonialism) کا توڑ عدمِ نوآبادیات (De Colonization) ہوتا ہے۔

دوسری جانب ملک کے اساسی معاہدے (قراردادِ لاہور 1940) سے لیکر بارہا اور

مسلسل معاہدے توڑنے کے نتیجے میں یہ ریاست سندھ پر حکمرانی کرنے کا قانونی، سیاسی اور اخلاقی جواز کھو چکی ہے۔ اب یہ صرف ڈنڈے کے زور پر چل رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ 1940 میں اتفاق پر مبنی بھائی چارہ جبری الحاق میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس لیے جدید دور کے تقاضوں اور مہذب دنیا کے معیارات کے مطابق اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر عمل پیرا ہوتے ہوئے لازم ہو گیا ہے کہ پاکستان کی ریاست کے بارے میں سندھی قوم سے از سرِ نو فیصلہ لیا جائے ۔ سندھی باشندوں کو اختیار دیا جائے کہ ''۔۔۔۔۔۔۔وہ اپنی آزادانہ رائے سے اپنی سیاسی حیثیت کا تعین کریں اور اپنی مرضی سے اپنی اقتصادی، سماجی اور ثقافتی ترقی کی راہ کا تعین کریں۔'' باالفاظِ دیگر سندھی قوم کو اپنا حقِ خودارادیت جو کہ فطری طور پر عالمی قانون کے مطابق ان کا حق ہے، وہ استعمال کرنے کا موقع دیا جائے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان کوئی فطری ملک نہیں ہے بلکہ ایک معاہدے کے تحت عمل میں آئی شراکت داری (پارٹنرشپ) ہے اور یہ معاہدہ ہے 1940 کی قرارداد۔ جب کوئی پارٹنرشپ بحران کا شکار ہو جائے (جیسا کہ اب پاکستان کی ریاست ہے) اور ایک پارٹنر مسلسل خلاف ورزی کرتا رہے تو پھر ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ اس شراکت داری، اس بھائی چارے کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے ماضی میں کیے گئے اساسی معاہدے (Founding Charter) کے مطابق عمل کیا جائے۔ 1940 کے اساسی معاہدے میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ''۔۔۔۔۔۔(ریاست کو) بنانے والے یونٹ (لازمی طور پر) آزاد (Sovereign)☆ اور خودمختار (Autonomous) ہوں گے۔'' سو وقت کا فیصلہ اور حالات کا تقاضا ہے کہ سندھ کی Sovereign حیثیت تسلیم کی جائے اور سندھی باشندوں کی رائے معلوم کرنے اور ان کا فیصلہ لینے کے لیے ریفرنڈم کیا جائے۔

پاکستان کی موجودہ شکل والی ریاست کے حامی دلیل دیتے ہیں کہ ''سندھی باشندوں کا

☆(Sovereign) کے معنی ہے وہ ہستی جو اقتدارِ اعلیٰ کی مالک ہو جس کے اختیارات کی کوئی حد نہ ہو اور جس کا فیصلہ آخری اور حتمی ہو)

فیصلہ آچکا ہے، اسمبلیوں کے انتخابات میں یہ پیپلز پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ پاکستان کی موجودہ ریاست کو قبول کرتے ہیں۔" اس دلیل کے کھوکھلے ہونے کا ثبوت کشمیر کے بارے میں پاکستان اور ہندوستان کے موقف سے باآسانی عیاں ہوتا ہے۔ جموں کشمیر میں گزشتہ 6 دہائیوں کے دوران ایک 1990 کی دہائی کو چھوڑ کر باقی سارا عرصہ اسمبلی کے انتخابات باقاعدگی اور عالمی معیارات کے مطابق ہوتے رہے ہیں اور ان انتخابات میں ہمیشہ وہ پارٹیاں اکثریت سے جیتتی آئی ہیں جو جموں کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملا کر رکھنے کے حامی ہیں۔ تو کیا پھر یہ کہا جائے کہ کشمیری عوام کو فیصلہ آ گیا ہے۔ لیکن پھر بھی پاکستانی ریاست اور اس کے حامی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ " کشمیریوں کو اپنے قومی حقِ خودارادیت استعمال کرنے کا موقع دیا جائے۔" اس کے لیے ان کی دلیل یہ ہے کہ اسمبلی کی سیٹ اور قومی آزادی کے لیے ووٹ میں فرق ہے۔ ان کی یہ دلیل بالکل درست ہے اور ہم ان کے اس موقف سے صدفی صد اتفاق کرتے ہیں۔ ہم اس میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ دلیل سندھ کی صورتحال پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ سندھ کے عوام انتہائی باشعور ہیں وہ جانتے ہیں کہ سندھ اسمبلی کی کیا حیثیت ہے، جس کی رائے سے زیادہ اہمیت پاکستان سیکریٹریٹ میں بیٹھے ہوئے ایک ڈپٹی سیکریٹری اور سیکشن افسر کے قلم کی ہے۔ اور سندھ کے عوام پاکستان کی قومی اسمبلی کی حیثیت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں جسے ایک بندوق بردار "سپاہی" گھر بھیج دیتا ہے۔ سندھ کے باشندے آزادی کی اہمیت سے بھی واقف ہیں کہ آزادی کے لیے جدوجہد انھیں تاریخی ورثے میں ملی ہے۔ اس لیے اسمبلی کے ووٹ کے وقت تو وہ پیپلز پارٹی کا ساتھ دیتے ہیں لیکن سندھ اور سندھی قوم کی زندگی و موت کے مسائل پر قوم پرست جدوجہد کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پیپلز پارٹی اور دیگر مرکزیت پسند پارٹیاں بھی سندھ کے قومی ایجنڈے کے مسائل پر آواز اُٹھانے کے لیے مجبور ہوتی ہیں۔

دوسری طرف ہندوستان کی حکومت ہے۔ اس کے بانی وزیراعظم جواہرلال نہرو اقوام متحدہ میں ساری دنیا کے سامنے وعدہ کر آئے کہ کشمیریوں کی اپنے مستقبل کے بارے میں رائے معلوم کرنے کی خاطر وہاں عوامی ریفرنڈم کرایا جائے گا۔ لیکن 62 سال گزرنے کے باوجود

ہندوستان سرکار اور وہاں کی اہم پارٹیاں کشمیریوں کے اقوامِ متحدہ کی طرف سے تسلیم شدہ حقِ خود ارادیت کو تسلیم کرنے اور ریفرنڈم کرنے سے گریزاں ہیں، اس کے باوجود کہ اسمبلی الیکشن میں بار بار ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی حامی جماعتیں جیتتی آرہی ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ہندوستانی ریاست کے کرتا دھرتا سمجھتے ہیں کہ انتظامی معاملات کے لیے دیے گئے اسمبلی کے ووٹ اور قومی حقِ خود ارادیت کے تحت ریفرنڈم کے ووٹ، ان دونوں میں فرق ہے اور انھیں یقین ہے کہ ریفرنڈم کی صورت میں کشمیری عوام کی اکثریت آزاد اور خود مختار کشمیر کے حق میں ووٹ دے گی۔

نہ صرف آزاد، خود مختار اور خوشحال سندھ کو حقیقت کا روپ دینے کی خاطر بلکہ پاکستان میں شامل دیگر اقوام بشمول پنجابیوں☆ کی آزادی اور خوشحالی اور سارے جنوبی ایشیا میں امن بھائی چارے، جمہوریت کے پنپنے اور اقتصادی ترقی کے لیے بھی پاکستان کی موجودہ ریاستی تشکیل میں بنیادی تبدیلی ناگزیر ہے۔ پاکستان کی ریاستی تشکیل لگ بھگ ایسی ہے جو یورپ کی صنعتی انقلاب سے قبل تھی۔ یورپ میں بھی کسی وقت تین عناصر کی بالادستی اور حاکمیت ہوتی تھی، جاگیرداروں ،ملائیت (پاپائیت) اور فوجی طاقت پر قائم ریاستیں اور بادشاہتیں۔ لگ بھگ ایک ہزار سال (پانچویں سے پندرویں صدی تک) پر محیط اس دور کو یورپ کی تاریخ کا تاریک دور کہا جاتا ہے جو جہالت، ظلم، بربریت، بھوک، بے روزگاری، جنگ و جدل اور مذہبی بنیاد پرستی سے بھرا ہوا تھا۔ 16ویں صدی کے بعد ان تین عناصر کی جگہ تین اور عناصر نے لی، یہ تھے سرمایہ داری، سیکولرازم اور قومی ریاستیں۔ ان کے مضبوط ہونے سے یورپ جمہوری دور میں داخل ہوا۔

پاکستان میں بھی گزشتہ 63 سال سے ریاستی امور اور نظم و نسق پر تین عناصر کی بالادستی رہی ہے، جاگیرداری، ملائیت اور فوجی طاقت کے زور پر قائم ریاست۔ گزشتہ 63 سال کے دوران، پہلے دن سے لیکر، ملک پے در پے بحرانات کا شکار ہے۔ قومی زبانوں کے مسائل، قوموں کے وجود کے معاملات، وسائل کی لوٹ کھسوٹ، سیاسی مخالفین کو ختم کرنا، فوجی چڑھائیاں، لگاتار مارشل لاء، مذہبی بنیاد پرستی، پڑوسی ممالک سے جنگیں، ان سب نے ملکر ملک کو ایک ایسی صورتحال

☆شہرہ آفاق فلسفی فریڈرک اینگلز کا کہنا ہے کہ وہ قوم خود آزاد نہیں ہوسکتی جو دوسروں کو غلام بناتی ہے

سے دوچار کردیا ہے جہاں دنیا والے اسے "ناکام ریاست" کہتے ہیں اور اس کے "خیر خواہوں" نے اس کے مستقبل پر بلکہ اس کے وجود پر بڑا سوالیہ نشان لگا دیا ہے جو ہر وقت کہتے ہیں کہ "ملک کی سلامتی کو خطرہ ہے۔" اور وہ "ملک کو بچانے کی جدوجہد کررہے ہیں۔" جب کہ جمہوریت اس ملک کے باشندوں سے کوسوں دور ہے۔ یہ اس لیے کہ جو تین عناصر پاکستان کی ریاست پر حاوی ہیں وہ اپنی ہیئت میں جمہوریت دشمن، عوام دشمن، اور ترقی دشمن ہیں۔

محض یورپی ممالک سے ہتھیار خرید کر اور ڈالرز اور پاؤنڈز کی خیرات لیکر ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ تبدیلی اور ترقی کے لیے مطلوبہ خیالات، نظریات اور اصولوں کو بھی اختیار کرنا ضروری ہے۔ سو اگر اس خطے کے لیے امن اور یہاں کے باسیوں کے لیے خوشحالی اور جمہوریت لانی ہے تو یہاں جمہوریت دوست عناصر کو آگے لانا ناگزیر ہے۔ یعنی جاگیرداری کی جگہ صنعت وتجارت، ملائیت اور مذہبی بنیاد پرستی☆ کی جگہ سیکولرازم اور بندوق کے زور پر قائم غیر فطری ریاست کی جگہ لوگوں کی مرضی اور خواہشات کی حامل قومی ریاستیں۔

ہمارے خطے میں ریاست، جمہوریت اور برابری کے حقوق وغیرہ کے بارے میں جو تصورات اور نظریات عام ہیں انھیں عرفِ عام میں مغربی جمہوریت یا بورژوا جمہوریت بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ نظام انسانی سماج کی ترقی کی معراج ہے اور یہ ہمیشہ رہے گا۔ دوسرا فلسفہ جو کہ آیا تو (مغربی) یورپ سے ہے لیکن اسے مارکسی فلسفہ کہا جاتا ہے۔ وہ اس سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کو انسانی سماج کی ترقی کا ایک مرحلہ سمجھتے ہوئے معاشرے کو آگے لیجانے کے لیے جدوجہد کا آوازہ بلند کرتا ہے۔ ریاست، جمہوریت اور برابری کے بارے میں اس کے اپنے خیالات ہیں۔ اس فلسفے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے روس میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ریاستی ڈھانچے کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کر دیا۔ سماج کے سب سے دھتکارے ہوئے لوگ جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کی قسمت میں محکومی لکھی ہے، انھیں اس

☆ یہاں یہ بات واضح طور پر سمجھنی چاہیے کہ پاکستان میں مذہبی بنیاد پرستی کو بڑھانے میں سب سے پہلا، بنیادی اور بڑا کردار ریاست کا ہے

انقلاب نے حاکم بنادیا۔یوں ایک بالکل مختلف قسم کی ریاست وجود میں آئی۔اس ریاست کے بانی ولادی میر لینن نے ریاست کی تشکیل، اس میں مختلف طبقات کے کردار، کثیر القومی ریاست میں قومی مسئلے بالخصوص جبری الحاق، نوآبادیات اور قوموں کے حقِ خودارادیت کے بارے میں نہایت ہی تفصیل سے اور نہایت ہی مدلل طریقے سے لکھا ہے۔دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی اس نظریے کے حامی کافی ہیں۔ان میں بہت سے سندھ کی قومی آزادی کی یہ کہہ کر مخالفت کرتے ہیں کہ ''ساری دنیا کے غریب ایک ہیں۔ مارکسزم بین الاقوامیت کا نظریہ ہے اور قومی بنیادوں پر تفریق بین الاقوامیت اور عالمی بھائی چارے کی نفی ہے۔'' وغیرہ۔ان میں سے کئی ایک قومی حقِ خودارادیت اور قومی آزادی کو رجعت پسند اور عوام دشمن عمل کہہ کر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔کچھ حقِ خودارادیت کی تو حمایت کرتے ہیں لیکن علیحدہ ریاست کی مخالفت کرتے ہیں۔ہمارا کہنا ہے کہ مارکسزم ایک سماجی سائنس ہے، یہ انسانی سماج کی ترقی کا ایک فارمولا ہے۔یہ بین الاقوامیت اور عالمی بھائی چارے کے حصول کے لیے ایک راہ دکھاتا ہے اور کامریڈ لینن اسے مزید واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صرف یہی ایک درست راستہ ہے۔آیئے دیکھیں کہ مارکسزم کا سب سے بڑا شارح اور محنت کش (پرولتاری) انقلاب کا بانی اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔

☆ . اگر ہم سوشلزم سے وفادار ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اس وقت ہم عوام کو بین الاقوامیت کا جذبہ پیدا کرنے کی تعلیم دیں۔ظالم اور جابر قوم میں یہ تعلیم مظلوم اور محکوم قوموں کی آزادی، علیحدگی کی حمایت کیے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔

☆ قوموں کے حقِ خودارادیت سے مراد ہے غیر قومی گروہوں سے ان (محکوم) قوموں کی ریاستی علیحدگی، آزاد قومی ریاست کی تشکیل۔

☆ حقِ خودارادیت یا حقِ علیحدگی سے انکار کا مطلب حقیقت میں ناگزیر طور پر غالب

قوم کے امتیازی حقوق کی حمایت ہوتا ہے۔

کچھ ''کامریڈ'' کہتے ہیں کہ اس وقت (پاکستان میں) قوموں کی آزادی کی بات کرنے سے طبقاتی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا۔ باقی جب سوشلسٹ نظام قائم ہو جائے گا تو پھر قومی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اس دلیل کا جواب خود کارل مارکس یوں دیتے ہیں۔

''کافی دنوں تک میرا یہ خیال تھا کہ انگریز مزدور طبقہ غالب آجائے تو آئرلینڈ☆ کی حکومت کا تختہ اُلٹ جائے گا۔ لیکن زیادہ گہرے مطالعے نے مجھے اس کے بالکل برعکس قائل کیا ہے۔ انگریز مزدور طبقے کو اس وقت تک کچھ حاصل نہ ہوگا جب تک وہ آئرلینڈ سے پیچھا نہیں چھڑا لیتا۔ انگلستان میں انگریز رجعت پسندی کی جڑیں آئرلینڈ کی محکومی میں پیوست ہیں۔''

بین الاقوامیت، پرولتاری (محنت کش) اتحاد، قومی حقِ خود ارادیت اور عالمی بھائی چارے کو واضح کرنے کے لیے لینن نے سویڈن سے ناروے کی علیحدگی کو مثال بنایا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ناروے کسی زمانے میں سویڈن کی بادشاہت کے ساتھ جبری الحاق میں تھا۔ پھر وہاں ناروے کی علیحدگی کی تحریک چلی جو یورپ میں بڑی متنازع تھی۔ عالمی سوشلسٹ تحریک بھی اس معاملے پر منقسم تھی۔ لینن ناروے کی علیحدگی کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اگر یہ (سویڈن کے سوشل ڈیموکریٹ) صرف عام طور پر قوموں کی آزادی کی نہیں بلکہ قوموں کے حقِ خود ارادیت، ناروے کے حقِ علیحدگی کی حمایت نہیں کرتے تو یقینی طور پر یہ سوشلزم اور جمہوریت سے غداری ہے۔'' دوسری جگہ لینن لکھتے ہیں کہ ''ہمارا فرض ہے کہ ہم پرولتاریہ کے اتحاد کے حق میں، ان کی طبقاتی یکجہتی کے حق میں قوموں کے حقِ علیحدگی کو تسلیم کریں۔''

لینن کا کہنا تھا کہ اگر کوئی ایک قوم دوسری قوم کی محکوم ہے تو دونوں قوموں کے باشندوں میں نفرت اور تصادم کی صورتحال پیدا ہوتی ہے جس کا اثر پرولتاریہ پر بھی پڑتا ہے۔ اور پھر دونوں (حاکم اور محکوم) قوموں کے جاگیردار اور سرمایہ دار اس نفرت اور تصادم کی صورتحال کو اپنے طبقاتی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح بین الاقوامیت میں رکاوٹ حائل ہوتی

☆ یاد رہے کہ آئرلینڈ اس وقت انگریزوں کا غلام تھا

ہے۔اس لیے اس رکاوٹ کو ختم کر کے عالمی بھائی چارے کا راستہ صاف کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محکوم قوم آزاد ہو۔ اس کے بعد دونوں قوموں کے غریب اور مظلوم طبقات کے اتحاد اور تعاون سے سوشلسٹ جمہوریت کے لیے جدوجہد آگے بڑھے گی۔

سندھ کی قومی آزادی اور بین الاقوامیت کے تعلق کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر دوسرا کوئی راستہ نہیں ہوگا کہ ہم سندھ کی جدید قومی تحریک کے بانی محترم جی، ایم، سید سے رجوع کریں۔ سید نے ایک سے زیادہ بار کہا اور لکھا ہے کہ "سندھ کی آزادی میری منزل نہیں بلکہ منزل کی طرف ایک مرحلہ یا قدم ہے۔ میری منزل عالمی امن، بھائی چارہ اور بنی نوع انسان کی ترقی ہے۔ میں اس سلسلے میں چاہتا ہوں کہ سندھ اپنا تاریخی کردار ادا کرے، لیکن مذہبی تعصب، نفرت، جنگی جنون اور لوٹ کھسوٹ پر مبنی پاکستان کی ریاست سندھ کے یہ کردار ادا کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس لیے میں سندھ کی قومی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں۔" اگر لینن (اور اس کی پارٹی) کی فکر اور جدوجہد کا احاطہ کیا جائے تو وہ یہ ٹھہرے گا کہ انھوں نے بین الاقوامیت، عالمی امن اور بنی نوع انسان کی برابری اور ترقی کے مقصد کے حصول کی خاطر ایک ملک کو آزاد کرایا (طبقاتی تفریق، لوٹ کھسوٹ اور جنگی جنون پر مبنی حکومت سے) اور وہ ایک ایسی نئی ریاست وجود میں لائے جو باقی دنیا میں آزادی، امن اور سوشلسٹ جمہوریت کی خاطر جدوجہد کے لیے ایک مثال اور مرکز بن گئی۔ اب جی، ایم، سید (اور ان کی پارٹی) کی سندھ کی قومی آزادی کے لیے جدوجہد لینن کی بین الاقوامی سوچ اور انقلابی جدوجہد کے زیادہ قریب ہے یا ان "پاکستانی سوشلسٹوں" کا کردار جو سندھ اور پنجاب کے درمیان حاکم اور محکوم کا رشتہ ختم کرنے اور پاکستان کی موجودہ ریاستی تشکیل کو تبدیل کیے بغیر سوشلسٹ انقلاب کی بات کرتے ہیں؟ یہ فیصلہ دنیا کے باشعور، ایماندار اور انسان دوست افراد کریں گے یا تاریخ کرے گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے فیصلے آ بھی رہے ہیں جو ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی انھیں نہیں دیکھتا یا دیکھتا ہے لیکن سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا یا سمجھتا ہے مگر سبق حاصل نہیں کرتا تو پھر اس کا کیا کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے کچھ دوست وہ ہیں جو سوشلسٹ آدرشوں اور انقلابی جدوجہد سے دست بردار

ہو چکے ہیں اور اصلاح کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہ بھی سندھ کی قومی ریاست (Nation State) بننے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ دنیا اب یکجا ہونے اور ایک ہونے کی طرف بڑھ رہی ہے اور قومی شناختیں اور قومی سرحدیں ختم ہو رہی ہیں، سو ایسے وقت میں قومی ریاست اور قومی شناخت کی بات کرنا فضول ہے۔ اس تناظر میں یہ سب سے بڑی مثال یورپی یونین کی دیتے ہیں اور اس طرز پر ایشیا کی نہیں تو کم از کم جنوبی ایشیا کی یونین بنانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آدھا سچ بیان کرتے ہیں اور کسی دانا کا قول ہے کہ "آدھا سچ پورے جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" ان کی یہ بات تو درست ہے کہ یورپ کے ممالک ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں اور سرحدی پابندیاں نرم کر رہے ہیں، جبکہ سرحدوں کے ختم ہونے کی منزل ابھی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ان کی یہ بات بھی جزوی طور پر درست ہے کہ یہ ممالک اپنی جدا شناخت کی علامات مثلاً علیحدہ سکے وغیرہ کو بتدریج ختم کرنے کے راستے پر گامزن ہیں۔ لیکن یہ (جنوبی) ایشیائی یونین کے دلدادہ دوست یہ نہیں بتاتے کہ یورپ میں یہ سب کچھ ان ممالک میں رہنے والی قوموں کی آزادرائے اور مرضی سے ہو رہا ہے۔ یہ اس نکتے پر بھی بات کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ یورپ (بالخصوص مغربی یورپ) اور ایشیا (بالخصوص جنوبی ایشیا) کی سماجی ترقی کی سطح میں کتنا فرق ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، کہ یورپ میں جب سرمایہ داری کی ترقی ہوئی تو وہاں قومی ریاستوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا جو مغربی یورپ میں بھی ڈھائی صدی قبل مکمل ہوا، جبکہ مشرقی یورپ میں یہ عمل کافی بعد میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی یورپ اور مشرقی یورپ کے ممالک کے اکھٹے ہونے کے وقت، رفتار اور طریقوں میں فرق ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود یورپ کے اندر جڑنے (integration) اور ٹوٹنے (dis integration) کا عمل ساتھ ساتھ جاری رہا۔ وہ ممالک جہاں قومیں آزاد ہو کر اپنی قومی ریاستیں قائم کر چکیں ہیں، وہاں اکھٹے ہونے کا عمل جاری ہے جبکہ وہ ممالک جہاں زیادہ (کثیر القومی) قومیں رہتی ہیں لیکن قومی ریاستوں کے بننے کا عمل مختلف اسباب کے باعث رُکا رہا وہاں علیحدگی کا سلسلہ جاری ہے۔ سوویت یونین کے ایک ملک کی جگہ 15 قومی ریاستیں وجود میں آ چکی ہیں جبکہ خود روسی فیڈریشن کے اندر خود مختاری کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ یوگو

سلاویہ کی 6 ریاستیں بن چکی ہیں☆ جبکہ چیکوسلواکیہ کے جسم سے دو ریاستوں کا جنم ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ''برطانیہ عظمیٰ'' جہاں سب سے پہلے صنعتی انقلاب آیا وہ بھی قومی خودمختاری کی تحریکوں کے شدید دباؤ میں ہے کیونکہ وہ بھی ایک سے زیادہ قوموں کا ملک ہے۔ اب (جنوبی) ایشیا کے ممالک میں سماج کی ترقی کی سطح کا (مغربی) یورپ سے موازنہ کیا جائے تو کتنا بڑا فرق ہے اور آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے دوڑنے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اگر یہ دوست واقعی اس خطے کے باشندوں کو امن، محبت اور دوستی کے ذریعے جوڑنا چاہتے ہیں اور یہاں یورپ جیسی ترقی دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر سب سے پہلے انھیں یورپی ''یونین'' کو ممکن بنانے والے عناصر کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے، خاص طور پر قومی ریاستوں کا قیام اور سیکولرازم کی بڑھوتری ونشوونما۔ باقی موجودہ شکل میں جنوبی ایشیا کی ریاستوں کو اکھٹا کرنے کی بات کرنے کا مقصد یہ ہوا کہ جاگیرداروں، قبائلی سرداروں، لٹیروں، جنگی جنونیوں اور مذہبی بنیاد پرستوں کو اکھٹا کرنا جو پہلے تو اکھٹے ہوں گے نہیں (کیونکہ ایسا ہونا سماجی سائنس کے منافی ہے) لیکن بالفرض یہ اکھٹے ہوتے ہیں تو اس سے خطے میں سماج کو مجموعی طور پر اور غریب لوگوں کی اکثریت کو خصوصی طور پر فائدہ پہنچے گا یا نقصان؟۔ اس سوال کا جواب ''نقصان'' کی شکل میں آنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ (جنوب) ایشیائی یونین کے دلدادہ دوست یہ سب کچھ انجانے میں کر رہے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قومی ریاستوں کے قیام کو روکنے کی ایک نئی کوشش ہے۔ ☆☆ بالفاظِ دیگر یہ انسانی سماج کی ترقی کے راستے میں ایک اہم اور ناگزیر مرحلے کو ٹالنے کی کوشش ہے۔

یہاں قوم اور قومی ریاست کے تاریخی پس منظر اور سیاسی ڈھانچے پر مختصر نظر مناسب ہو گی۔ پرانے دور میں مملکت/ریاست کا دارومدار حکمران کے گھوڑے اور تلوار پر ہوتا تھا۔ جس حکمران کے پاس جتنی فوجی طاقت ہوتی تھی اور وہ دنیا کے جتنے حصے پر قبضہ کر سکتا تھا، وہ ایک مملکت یا حکومت کہلاتی تھی۔ اس میں مختلف نسلوں، زبانوں، مذہبی فرقوں اور جدا تاریخی اور تہذیبی پس منظر رکھنے

☆ کوسووکا تنازع معاملہ الگ ہے

☆☆ ماضی میں ان لوگوں کی اکثریت سوشلزم کے نام پر قومی تحریکوں اور قومی ریاستوں کی مخالفت کرتی رہی ہے

والے لوگوں کے گروہ رہتے تھے۔اور پھر ان کے درمیان فسادات،تصادم اور جنگوں کی صورتحال چلتی رہتی تھی،جن کے نتیجے میں انسانی سماج ترقی اور اتحاد کی بجائے تنزلی اور تصادم کا شکار ہوتا رہتا تھا۔اس صورتحال سے اس ضرورت اور اس خیال نے جنم لیا کہ لوگوں کی وسیع سلطنتوں کی بجائے ایسے چھوٹے گروپوں کی شکل میں ساتھ رہا جائے جن کا پس منظر ایک ہو،جن کے مفادات ایک دوسرے سے ملتے ہوں، جو ایک دوسرے کی زبان سمجھ سکیں اور جو آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ کر سکیں،اور ایک دوسرے کو سمجھ سکیں تا کہ انسانی سماج کی ترقی میں آسانی ہو۔

اس ضرورت اور اس سوچ کے نتیجے میں قومی ریاستیں وجود میں آئیں جن کے باشندوں کو ایک قوم کہا گیا اور جس کی بنیادیں یہ تھیں کہ ان لوگوں کا ایک جغرافیہ ہو، یعنی ایک ملحقہ (Contiguous) خطے میں رہتے ہوں،ان کی ایک تاریخ،ایک زبان اور ایک کلچر ہو اور ان کے مشترکہ سیاسی واقتصادی مفادات ہوں۔یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر دنیا میں قوموں کو تسلیم کیا جاتا ہے۔اب اگر ان معیارات کو اس خطے پر لاگو کیا جائے تو پاکستان نہیں بلکہ سندھ ایک قوم کے وطن کے طور پر سامنے آتا ہے جسے نہ صرف اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا حق ہے بلکہ یوں کرنا سماجی ترقی کے اصول کے عین مطابق ہے۔سندھ کی کم از کم پانچ ہزار سال کے تسلسل کی تاریخ ہے۔ تھوڑے بہت فرق سے اسی جغرافیائی خطے میں سندھی باشندے رہتے آ رہے ہیں۔ان کی ایک پرانی اور شاندار تہذیب اور ثقافت ہے اور یہ ایک زبان بولتے ہیں جو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔دوسری طرف پاکستان صرف 63 سال قبل مختلف فریقوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کے تحت وجود میں آیا اور اس میں مختلف تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے حامل اور ایک دوسرے سے بالکل جدا زبان اور ثقافت کے حامل لوگ رہتے ہیں۔پاکستان بننے سے قبل اس کے رہنما کہتے تھے کہ یہ "مسلم قوم" کا ملک ہوگا، بننے کے بعد کہنے لگے کہ "نہیں یہ پاکستانی قوم ہے۔" اور یہ صورتحال آج تک چلتی آ رہی ہے کہ کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ "اسلامی ریاست" ہے تو کبھی "سب سے پہلے پاکستان" کے نعرے کے تحت "اسلامی ممالک" پر چڑھائی کی جاتی ہے۔

سندھ اور بلوچستان کی قومی تحریکوں کی مخالفت میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ "وہ

جاگیردار، سردار، وڈیرے، ترقی (Development) کے مخالف ہیں جو قومی آزادی کی اور قومی ریاستوں کی بات کرتے ہیں۔" اس دلیل (درحقیقت شوروغل) میں حکمرانوں، رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں سب کی آواز شامل ہے، اور سب کا موقف ایک ہے۔ اس

دلیل کا ہم دو پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔ ایک اندرونی صورتحال اور دوسری عالمی صورتحال۔ سندھ کی قومی تحریک مکمل طور پر درمیانے طبقے بلکہ حقیقت میں نچلے درمیانے طبقے پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک نام کا بھی وڈیرہ، جاگیردار شامل نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں سندھ کے سارے وڈیرے، جاگیردار جو ہر قسم کی ترقی کے دشمن ہیں (ثابت شدہ) وہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کی معرفت سندھ کی قومی تحریک کے سخت مخالف ہیں اور مضبوط مرکزی حکومت کے وفادار ہیں۔ اسی طرح بلوچستان کے مستند سرداروں میں سے صرف دو قومی آزادی کی تحریک کے طرفدار رہے ہیں باقی سب مرکزی سرکار کے حامی اور اس کے ساتھ رہے ہیں جو کہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ باقی ساری قومی تحریک کو تو غریبوں کے بچے چلا رہے ہیں۔ کیونکہ بلوچستان میں تو سندھ جتنا بھی درمیانہ طبقہ (مڈل کلاس) نہیں ہے۔ جہاں تک ترقی کا سوال ہے تو 95% سردار جو سارا عرصہ پاکستان کے "سچے وفادار" رہے ہیں ان کے علاقوں میں بھی تو ترقی نہیں ہوئی ہے۔ یہی صورتحال سندھ میں بھی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ پاکستان کی ریاست بنیادی طور پر سندھ اور بلوچستان کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ اس کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر استوار ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ترقی اور قومی آزادی میں تعلق کے حوالے سے عالمی سطح پر کیا صورتحال ہے۔ کینیڈا کا شمار دنیا کے 8 سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور امیر ممالک میں ہوتا ہے، کیوبیک اس کا ایک امیر صوبہ ہے، کینیڈا کا سب سے بڑا شہر مونٹریال وہیں اور صوبے کی 98% آبادی شہروں میں رہتی ہے، لیکن زبان کی بنیاد پر☆ یہ قومی حقِ خودارادیت کو بنیاد بناتے ہوئے کینیڈا سے الگ ہو کر اپنی قومی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں آزادی کے نکتے پر دو بار ریفرنڈم ہو چکا ہے۔ 1980 میں ہونے والے ریفرنڈم میں 41.8 فی صد لوگوں نے آزادی کے

☆ کیوبک کے باشندے فرانسیسی زبان بولتے ہیں جبکہ باقی کینیڈا میں انگریزی زبان بولی جاتی ہے

حق میں ووٹ دیا جبکہ 1995 میں یہ ووٹ بڑھ کر 49.4 فی صد ہو گیا۔ برطانیہ وہ ملک ہے جہاں سب سے پہلے صنعتی ترقی ہوئی۔ عام طور پر برطانیہ کو انگریزوں کا ملک سمجھا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں انگریزوں کا ملک انگلینڈ ہے۔ باقی دیگر قوموں کے ممالک، ویلز، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ پر انگریزوں نے مختلف اوقات میں قبضہ کر کے انھیں اپنے ساتھ ملایا اور پہلے برطانیہ عظمیٰ اور پھر یونائیٹڈ کنگ ڈم (U.K) بنائی۔ ان قوموں کی جانب سے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریکیں جاری ہیں جو مختلف مراحل اور شکلوں میں ہیں۔

زمینی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہونے کے باعث اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ کا ایک دوسرے سے تعلق ناگزیر امر تھا۔ یہ تعلق تاریخ میں کبھی گرم تو کبھی سرد رہا، دونوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں اور پھر صلح بھی۔ یہ کبھی اکھٹے رہے تو کبھی جدا۔ آخر 1707 میں ایکٹ آف یونین (Act of Union) کے ذریعے انگریزوں نے اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ کو ختم کر کے اسے انگلینڈ کی بادشاہت کا حصہ بنا دیا۔ اس وقت سے لیکر اسکاٹ لینڈ کے باشندوں کی اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے جدوجہد کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی ہے۔ وہاں کے قوم پرستوں نے 1934 میں "اسکاٹش نیشنل پارٹی" قائم کی جس کا مقصد اسکاٹ لینڈ کی آزادی مقرر کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لندن ویسٹ منسٹر میں قائم برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت ہونے کے باوجود اسکاٹ لینڈ کے باشندوں کو کافی خودمختاری حاصل تھی۔ ایسا ہونے کے باوجود کہ برطانیہ وحدانی طرزِ حکومت کا حامل ملک کہلاتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ کا عدالتی نظام باقی ملک سے مختلف ہے، تعلیمی نظام الگ ہے اور یونین جیک کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا الگ جھنڈا بھی ہے۔ یہاں تک کہ کھیل کے میدانوں میں ان کی الگ الگ ٹیمیں ہیں جو عالمی مقابلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کھیلتی ہیں۔ اقتصادی، سماجی اور سائنسی میدان میں بھی اسکاٹ لینڈ ایک ترقی یافتہ خطہ ہے جو کسی بھی طرح انگلینڈ سے پیچھے نہیں ہے۔ اس کے باوجود اپنی سیاسی خودمختاری کے لیے ان کی جدوجہد جاری رہی ہے۔ اسکاٹش قوم پرستوں میں سب سے پیش "اسکاٹش نیشنل پارٹی" ہے جو آزاد اور خودمختار ریاست کے لیے مصروفِ جہد ہے۔

1997 میں جب برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت تھی تو انہوں نے اسکاٹش قوم

پرستوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا سامنا کرنے کے لیے اسکاٹ لینڈ کی نیم خودمختار پارلیمنٹ کا منصوبہ پیش کیا گیا جسے کافی معاملات میں اپنے ٹیکس لگانے کا اختیار تھا۔اس منصوبے کے لیے ریفرنڈم کیا گیا۔ایس،این،پی کے حمایت ہونے کے باعث اسکاٹ لینڈ کے 70فی صد سے زائد ووٹرز نے اس کے حق میں رائے دی۔یوں کچھ کم تین سوسال کے بعد پھر اسکاٹ لینڈ کی پارلیمنٹ وجود میں آئی جس کے انتخابات 1999 میں ہوئے۔

ان انتخابات میں اکثریت یونین کی حامی لیبر پارٹی کو حاصل ہوئی اور اس کا ایک MP نوقائم شدہ فرسٹ منسٹر کے عہدے پر فائز ہوا۔جبکہ آزادی پسند اسکاٹش نیشنل پارٹی کے بھی کچھ ممبر منتخب ہوئے جن کی تعداد میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔بہرحال نیم خودمختیار پارلیمنٹ میں جانے کے باوجود ایس،این،پی کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رہی اور ان کا اعلان تھا کہ ''ہم نے جب بھی اکثریت حاصل کی تو آزادی کے نکتے پر ریفرنڈم کرائیں گے۔'' حال ہی میں اسکاٹش پارلیمنٹ کے ہونے والے انتخاب میں اسکاٹش نیشنل پارٹی اکثریت سے جیتی ہے ،جس کے نتیجے میں اس بحث میں شدت آگئی ہے کہ شاید رواں سال 2011 کے آخر تک یہ ریفرنڈم ہوجائے اور 2012 میں یورپی یونین اور اقوامِ متحدہ میں ایک اور ممبر کا اضافہ ہوجائے۔☆

اب ہم قومی حقِ خودارادیت کے حوالے سے دنیا کے کچھ دیگر ممالک کی مثالوں پر نظر ڈالیں گے۔ایک مثال تو کیوبک کی ہے جس کا ذکر ہوچکا ہے۔وہاں کی قوم پرست جماعت ایک بار پھر ریفرنڈم کے لیے خود کو اور عوام کو تیار کررہی ہے۔ماضی قریب میں قومی حقِ خودارادیت کو استعمال کر کے آزادی حاصل کرنے والا ملک (مشرقی) تیمور ہے۔یورپی نوآبادیاتی طاقت پرتگال کے 1975 میں بوریا بستر گول کرتے وقت پڑوسی ملک انڈونیشیا نے فوجی طاقت کے ذریعے تیمور کو

☆ یہ ریفرنڈم 2014 میں منعقد ہوا جس میں 45 فیصد لوگوں نے آزادی کے حق میں اور 55 فیصد نے یونین کے حق میں ووٹ دیا۔ لیکن 2016 میں یورپی یونین سے علحدگی کے معاملے پر ہونے والے ریفرنڈم میں باقی UK کی برعکس اسکاٹلینڈ کے یورپی یونین میں رہنے کی حق میں ووٹ کے بعد یہ بحث تیز ہوگئے ہے کہ U.K سے آزادی کے اشو پر ایک اور ریفرنڈم کرایا جائے۔

اپنے ساتھ ملایا جس کے ساتھ ہی وہاں قومی آزادی کی جنگ شروع ہوگئی۔ یہ مسلح جنگ تھی، لڑائی چلتی رہی اور دنیا کی صورتحال میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور عالمی سطح پر قومی ریاست کے قیام کے لیے اہلِ تیمور کی جدوجہد کو پذیرائی ملنے لگی۔ یوں (مشرقی) تیمور کی قسمت کا فیصلہ آخر میں پُرامن طریقے سے حقِ خودارادیت کے استعمال کے ذریعے ہوا۔☆ دنیا کے مختلف ممالک اور تنظیمیں بالخصوص اقوامِ متحدہ درمیان میں آئے اور اصولی طور پر یہ طے ہوا کہ مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے (مشرقی) تیمور کے عوام کی رائے لی جائے گی۔ اقوامِ متحدہ کے زیرِ نگرانی 2002 میں ریفرنڈم ہوا جس میں تیموری عوام کی اکثریت نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا اور یوں دنیا کے نقشے پر ایک اور آزاد و خود مختار ملک وجود میں آیا۔

(مشرقی) تیمور سے ملتی جلتی صورتحال (مغربی) صحارا کی ہے شمال مغربی افریقہ کا یہ ملک اسپین کے زیرِ قبضہ رہنے کی وجہ سے ہسپانوی صحارا بھی کہلاتا تھا۔ 1975 میں اسپین کی واپسی کے وقت پڑوسی ملک مراکش نے صحارا پر قبضہ کرلیا۔ انقلابی تنظیم ''پولیساریو'' نے اس قبضے کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی۔ اقوامِ متحدہ کی ثالثی کے تحت 1991 میں معاہدہ ہوا، ''پولیساریو'' نے جنگ بندی کی اور اگلے سال جنوری میں صحارا کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے ریفرنڈم کے انعقاد کا طے ہوا کہ صحارا کے عوام آزاد ہونا چاہتے ہیں یا مراکش کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ریفرنڈم آج تک نہیں ہوسکا ہے جس کی اہم وجہ آبادی کا مسئلہ ہے۔ مغربی صحارا اراضی کے لحاظ سے بڑا لیکن آبادی کے لحاظ سے چھوٹا ملک ہے جس کی کُل آبادی تین لاکھ کے لگ بھگ ہے، جبکہ مراکش نے اپنے ساڑھے تین لاکھ باشندے یہاں آباد کررکھے ہیں۔ مراکش ان باشندوں کو بھی ریفرنڈم میں شامل کرنا چاہتا ہے جبکہ طے شدہ معاہدے کے تحت صرف ان لوگوں کو ووٹ کا حق حاصل تھا جو 1974 میں ہسپانوی انتظام کے تحت کی گئی مردم شماری میں صحارا کے باشندے تھے۔ ریفرنڈم میں تاخیر کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ امریکا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنے مفادات کے باعث

☆ ہر چند کہ انڈونیشیا کی فوج نے اپنی حامی ملیشا کے ذریعے وہاں قتل و غارت گری کرا کے ریفرنڈم کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی لیکن تیمور کے انقلابی اشتعال میں نہیں آئے

مراکش کی طرفداری کررہا ہے۔

ہماری صورتحال سے مماثلت رکھنے والا معاملہ اریٹریا کا ہے۔اریٹریا پہلے ترکوں کی اور پھر اٹلی کی کالونی رہا۔دوسری عالمگیر جنگ کے دوران 1941 میں برطانیہ نے اٹلی کوشکست دیکر اریٹریا پر قبضہ کرلیا۔جنگ کے خاتمے کے بعد برطانیہ کے لیے دنیا پر اپنا سامراجی قبضہ برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تو اس نے اپنا بلاواسطہ اثر ورسوخ بحال رکھنے کی غرض سے ایک ایسی پالیسی اختیار کی جس کے تحت اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق کئی ایک نئے بلک بنائے گئے تو کہیں قوموں / ملکوں کو اپنی وفادار حکومتوں کے حوالے کیا گیا۔اس پالیسی پر عمل درآمد کی خاطر برطانوی بادشاہ نے نئی اُبھرتی ہوئی سامراجی طاقت امریکا کی مدد سے اقوامِ متحدہ کے نو قائم شدہ ادارے کو بھی خوب استعمال کیا ۔اس پالیسی کے تحت اریٹریا کو ایتھوپیا کی بادشاہت سے ملا دیا گیا البتہ ایتھوپیا کو ایک فیڈریشن قرار دیا گیا جس میں اریٹریا کو خصوصی حیثیت حاصل تھی جس کی اپنی ایک خودمختار حکومت تھی۔لیکن پھر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ طاقت کے زور پر حق وانصاف کا خون کیا جاتا ہے سو اسی طرح ایتھوپیا نے بھی پاکستان کی طرح کیے گئے معاہدے سے روگردانی کرتے ہوئے 1962 میں اریٹریا کی خود مختار حیثیت کو ختم کرتے ہوئے اسے ایتھوپیا کا صوبہ بنادیا۔اسی دن سے اریٹریا کی جنگِ آزادی کی ابتدا ہوئی جس کی قیادت پہلے اریٹرین لبریشن فرنٹ (ELF) اور پھر اریٹرین پیپلز لبریشن فرنٹ (EPLF) نے کی۔دوسری جانب ایتھوپیا کے اندر بھی جمہوریت کے لیے اور دوسرے علاقوں کی صوبائی خودمختاری کے لیے تحریک نے زور پکڑا اور انھوں نے ملکرا یتھوپیا کے عوامی انقلابی جمہوری محاذ (EPRDF) کی تشکیل کی۔آگے چل کر ایتھوپیا کے جمہوریت پسندوں نے اریٹریا کے قومی حقِ خودارادیت کو تسلیم کیا۔پھر دونوں نے ملکرا یتھوپیا میں بادشاہت کی جگہ لینے والی فوجی ڈکٹیٹرشپ کے خلاف جنگ کی اور مئی 1991 میں آمریت کو شکست دی۔دونوں فریقین کے درمیان ہونے والی صلح کے مطابق ایتھوپیا سے منسلک اریٹریا کی خودمختار حکومت دوسال کے لیے اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں قائم کی گئی۔دوسال بعد پروگرام کے مطابق اپریل 1993 میں اقوامِ متحدہ اور دیگر عالمی اداروں کی نگرانی میں اریٹریا کی آزادی کے بارے میں عوامی ریفرنڈم کرایا گیا۔ایک

غریب، کچلے ہوئے تباہ حال ملک کے باوجود اس ریفرنڈم میں اریٹریا کے رجسٹرڈ ووٹروں میں سے 98% نے اپنی رائے کا حق استعمال کیا۔ رائے دہندگان میں سے 99% نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا۔ یوں آزاد اریٹریا کی صورت میں اقوامِ متحدہ میں ایک اور ملک کا اضافہ ہوا۔

ہمارے (جغرافیائی طور پر) قریب اور پاکستان کی ریاست سے متعلقہ مسئلہ کشمیر کا ہے۔ اپنی تاریخ، ثقافت اور زبان کے حساب سے کشمیر کا ایک الگ تشخص ہے۔ جب برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تو کشمیر کے بھی دو حصے کیے گئے۔ پاکستان کی آشیرباد اور مدد سے قبائلی لشکر نے 1948 میں کشمیر پر چڑھائی کی تو دوسری طرف سے بھارت نے اپنی فوج روانہ کی اور کشمیر کے راجا سے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق کرایا۔ دونوں ملکوں میں جنگ بندی ہوئی جہاں تک بھارتی افواج گئیں وہاں تک بھارت کا قبضہ اور جہاں تک قبائلی لشکر گیا وہاں تک پاکستان کا قبضہ ہوا۔ یہ صورتحال آج تک جاری ہے۔ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے جبکہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر اسے اپنا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ کشمیری تاریخی، سیاسی اور ثقافتی بنیادوں پر اپنے لیے قومی حقِ خودارادیت کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے لیے وہ اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق ریفرنڈم چاہتے ہیں تا کہ کشمیری عوام اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرسکیں کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں یا کسی ملک کے ساتھ ملکر رہنا چاہتے ہیں۔

بھارت کے عالمی سطح کے وزیر اعظم اور جنگِ آزادی کے ہیرو جواہر لال نہرو خود مسئلہ کشمیر کو اقوامِ متحدہ میں لے گئے جہاں ریفرنڈم کے حق میں قرارداد منظور ہوئی۔ لیکن آج تک بھارت اس پر عمل نہیں کرتا۔ دوسری جانب پاکستان حقِ خودارادیت کی لفظی حمایت تو کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کہتا ہے کہ "کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔" اس مطالبے سے

تو قومی حقِ خودارادیت کے بنیادی مفہوم کی ہی نفی ہوتی ہے کیوں کہ خودارادیت کے حق کا مطلب ہے قومی ریاست قائم کرنے کا حق۔ ایک بار پاکستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی کی سند یافتہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے صحافیوں نے سوال کیا کہ "آپ کشمیر کے لیے حقِ خودرادایت کا تو

مطالبہ کرتے ہیں لیکن تیسرے آپشن (Third Option) ☆ کی حمایت نہیں کرتے، اس کی کیا وجہ ہے؟'' اس پر ان کا جواب نہایت ہی دلچسپ تھا۔ کہنے لگیں کہ ''اگر ہم نے کشمیر کے لیے تھرڈ آپشن (قومی ریاست) کا مطالبہ کیا تو پھر پنڈورا بکس کھل جائے گا اور پھر دیگر خطوں کے لوگ بھی ایسا مطالبہ کریں گے۔'' یعنی وہ ایک قوم (کشمیری) کو اس کا فطری اور تاریخی حق دینے کو اس لیے تیار نہیں کہ کہیں دیگر قوموں (مثلاً سندھی، بلوچ) کو بھی یہ حق نہ دینا پڑ جائے۔ اس سے یہ بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کو کشمیریوں کی آزادی سے نہیں بلکہ اپنی ریاستی توسیع پسندی سے دلچسپی ہے۔ پاکستانی ریاست کے موقف کے کھوکھلے پن اور دوغلے پن کا اس سے بھی اظہار ہوتا ہے کہ یہ (حکمران) سندھ اور بلوچستان کے لیے قومی خودمختاری کے لفظ کی بھی مخالفت کرتے ہیں، اس کے باوجود کہ کشمیر کو سندھ اور بلوچستان کے مقابلے میں زیادہ اندرونی خودمختاری حاصل ہے۔ ہندوستان کے آئین کے آرٹیکل نمبر 370 کے مطابق کشمیر کو ایک خصوصی حیثیت (Status) ملا ہوا ہے جس کے تحت کوئی بھی غیر کشمیری نہ تو وہاں کی شہریت حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی ملکیت یا جائیداد خرید سکتا ہے۔ مذکورہ بالا ساری بحث اور دلائل کے نتیجے میں کچھ نکات کسی بھی شک وشبے سے بالاتر ثابت ہو چکے ہیں۔ یہ

☆ دنیا کی ساری اقوام کو تاریخی اور فطری طور پر قومی خودارادیت کا حق حاصل ہے۔

☆ اقوامِ متحدہ بھی حقِ خودارادیت کو قوموں کے ناقابلِ منتقلی (Inalienable) حق کے طور پر تسلیم کر چکا ہے جس کے تحت انھیں اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔

☆ پاکستان ایک نوآبادیاتی (Colonial) ریاست ہے جس میں پنجاب حاکم اور سندھیوں سمیت دیگر قومیں محکوم ہیں۔

☆ 1940 کی قرارداد کے تحت اعلان شدہ رضاکارانہ بھائی چارے کی بجائے سندھ

☆ کشمیر کی سیاسی ڈکشنری میں تھرڈ آپشن سے مراد بھارت اور پاکستان سے مل جانے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی آزادی کا نکتہ شامل کرنا ہے۔

کا پنجاب سے تعلق جبری الحاق پر مبنی ہے۔

☆1940 کے اساسی معاہدے اور اس کے بعد یک طرفہ طور پر کیے گئے بار بار کے معاہدوں کو پاکستان کی ریاست کی طرف سے بار بار یک طرفہ طور پر توڑا گیا ہے جس کی وجہ سے پاکستان کی ریاست سندھ پر حکمرانی کرنے کا قانونی، سیاسی اور اخلاقی جواز کھو چکی ہے۔

☆سندھی باشندوں کو فطری طور پر، تاریخ کی روشنی میں پاکستان کو وجود بخشنے والی 1940 کی قراردادِ لاہور کے مطابق اور بین الاقوامی قانون کے تحت یہ حق حاصل ہے کہ (اور پاکستان کی 63 سالہ تاریخ ان پر یہ فرض عائد کرتی ہے) وہ پاکستان کی ریاست اور سندھ کے مستقبل کے بارے میں ازسرِ نو فیصلہ کریں۔

☆ پاکستان کی ریاست پر پہلے دن سے تین عنصر جاگیردار، فوج اور مُلا غالب رہے ہیں جو اپنی ساخت، فطرت اور کردار میں جمہوریت مخالفت اور ترقی مخالف ہیں۔ نتیجے میں جہالت ،بھوک، بے روزگاری، آمریت، نسل پرستی، مذہبی بنیاد پرستی اور دہشت گردی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

اس ساری صورتحال میں لازم ہوگیا ہے کہ سندھی باشندے اپنی تاریخی حیثیت کی بحالی ،قومی تشخص کی بقا، سیکولر کردار میں ترقی و بڑھوتری کی خاطر اپنی قومی ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کریں تاکہ یہ امنِ عالم، پرامن بقائے باہمی اور بنی نوع انسان کی ترقی کے مشن میں اپنا تاریخی کردار ادا کرسکیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے انھیں فطری طور پر حاصل اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ قومی حقِ خودارادیت استعمال کرنا چاہیے اور پاکستان سمیت دنیا بھر کے جمہوریت پسند اور انسان دوست افراد، گروپوں، تنظیموں اور اداروں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس خطے میں امن، ترقی، خوشحالی، بھائی چارے اور جمہوریت کے فروغ اور استحکام کی خاطر اس مقصد کے حصول میں سندھی باشندوں کی مدد کریں۔

☆☆☆